Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1965

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم
(سابق وزیر تعلیم حکومت ہند) کے قلم سے

"کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے ۔ وہ آبرو باختہ ہیں ۔ عزت نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں ۔ قسمیں کھاتے ہیں ، حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے ، اس میں دوام و استمرار ہے ۔ یہ عہد محکم ہے ، یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے ۔ زبان سے کہہ دیتے ہیں لیکن کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے ۔ یہ واقعات کو جھٹلاتے ہیں ، اصلیت کو چھپاتے ہیں ۔ ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں ، نقض امن کرتے ہیں اور پھر اس کو حفظ امن کا لباس پہناتے ہیں ، قتل کرتے ہیں اور اسے جاں بخشی دکھاتے ہیں ۔ بات کچھ ہوتی ہے لیکن اپنی بات کی پچ میں جمہور (پبلک) کو کچھ اور جتاتے ہیں ۔ خبردار ! یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں ۔ ان کے حلف پر نہ جانا ۔"

(الہلال ۔ مورخہ ۲۷ ۔ اگست ۱۹۱۳ ، صفحہ ۹)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک

پاک و ہند سے

سالانہ ——— دس روپے

غیر ممالک سے

سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاک و ہند سے

ایک روپیہ

ٹیلیفون (۸۰۸۰۰)

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

۲۵/ربی۔ گلبرگ

لاہور

جلد ۱۸ | نومبر ۱۹۶۵ء | نمبر ۱۱

فہرست مضامین

انتساب ——— ۲

صدائے بازگشت ——— ۳

لمعات ——— ۴

شہر کے لوگ ——— (ریڈیو پاکستان لاہور سے پرویز صاحب کی تقریر) ——— ۲۱

ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے ——— ۲۵

جنگ کی برکات ——— ۳۷

سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ ——— (محترم خورشید عالم صاحب) ——— ۴۵

مسئلہ کشمیر ——— (صفدر سلیمی) ——— ۵۰

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء ——— ۷۳

بچوں کا صفحہ ——— ۷۸

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک

پاک و ہند سے

سالانہ ——— دس روپے

غیر ممالک سے

سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاک و ہند سے

ایک روپیہ

ٹیلیفون (۸۰-۸۰۰)

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

۲۵/بی-گلبرگ

لاہور

جلد ۱۸	نومبر ۱۹۶۵ء	نمبر ۱۱

فہرست مضامین

انتساب ——— ۲

صدائے بازگشت ——— ۳

لمعات ——— ۴

شہر کے لوگ ——— ریڈیو پاکستان لاہور سے پرویز صاحب کی تقریر ——— ۲۱

ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے ——— ۲۵

جنگ کی برکات ——— ۳۷

سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ ——— محترم خورشید عالم صاحب ——— ۴۵

مسئلہ کشمیر ——— صفدر سلیمی ——— ۵۰

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۵ء ——— ۷۳

بچوں کا صفحہ ——— ۷۸

انتساب

(طلوع اسلام - جنوری ۱۹۴۸ء)

محاذِ کشمیر کی داستانِ سادہ و رنگین بیان کرتے ہوئے، خان بابا حاجی گل نے کہا:

بارہ مولا کے ہسپتال میں ایک زخمی مجاہد کو لائے۔ سولہ سترہ برس کا نوجوان۔ شاخِ طوبیٰ کی طرح بلند قامت چمکتی ہوئی پیشانی، دمکتا ہوا چہرہ، سرخ و سپید رنگت، آنکھوں میں حسنِ یوسف کی معصومیت نور افشاں۔ پلکوں کے جھکاؤ میں دامنِ مریم مروحہ جنباں۔ سر سے پا تک شبابِ بے داغ کا نورانی مجسمہ۔ زخموں کے فشار سے تمام سینہ لالہ بار۔ اور لہو کی رنگینی سے جیب و داماں پُر بہار۔

— آیا اور ہسپتال کی دیوار کے ساتھ پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ عزم و استقامت کا پیکرِ خاموش!

ڈاکٹر نے خونچکاں کرتہ، اٹھا کر دیکھا تو سینہ گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ میں اور ڈاکٹر محوِ حیرت تھے کہ یہ اس وقت تک زندہ کیسے رہا؟

ڈاکٹر سامانِ جراحت کی فراہمی میں مصروف تھا۔ میں دیگر ضروریات کی تلاش میں مشغول۔ اور وہ زخمی شیر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بدستور خاموش!

اتنے میں باہر میدان میں کچھ شور سا اٹھا۔ ایک نعرہ بلند ہوا اور آواز آئی۔

غازیانو مخکے زئی - د خدائے نصرت تاسرہ دے

مجاہدو! آگے بڑھو۔ خدا کی نصرت تمہارے ساتھ ہے۔

نوجوان سپاہی کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر کو اٹھیں۔ رائفل کا سہارا لے کر جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور لانبے لانبے قدم اٹھاتا، خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اور ان خون کے قطروں کے سوا جنہیں صحنِ ہسپتال کی خاک کے ذروں نے ابھر کر چوم لیا تھا، عزم و ایمان کی اس داستانِ خاموش کا کوئی نشان پیچھے نہ رہا۔

طلوع اسلام — اس مجاہدِ گمنام کے مقدس خون کے ان قطرات سے انتساب کا شرف حاصل کرتا ہے۔ جن میں زندگی کی صحیح تفسیر جھلمل جھلمل کر رہی ہے اور جن کی ضیا پاش رنگینیاں اپنے ثبات و دوام سے اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کر رہی ہیں کہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

صدائے بازگشت

گذشتہ ستمبر کے زلزلہ انگیز دنوں کی بات ہے۔ میں دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ اطلاع ملی کہ ایک فوجی نوجوان ملنے کے لئے آیا ہے۔

چند لمحوں میں میرے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ گرد و غبار سے اَٹی ہوئی وردی۔ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے بوٹ۔ بکھرے ہوئے بال۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی۔ متوسط قامت۔ اکہرا بدن۔ زرد سے چہرے پر بچپن کے بھولے پن اور شباب کے ولولوں کا حسین امتزاج۔ لیکن آنکھوں میں بجلی کی سی چمک۔ کہنے لگا کہ سیدھا محاذ سے آرہا ہوں۔ میں نے کہا کہ عزیزم! یہ تو تمہاری صورت ہی سے عیاں ہے۔

کہا کہ ابا جان طلوع اسلام پڑھتے ہیں۔ ہمارے گھر میں قرآن کریم کا چرچا رہتا ہے۔ دو تین دن ہوئے ان کا خط آیا تھا کہ اگر تھوڑی سی بھی فرصت مل جائے تو پرویز صاحب سے ضرور ملنا اور کہنا کہ وہ ہمارے لئے دعا کریں۔ مجھے آج ایک محاذ سے دوسرے محاذ کی طرف جانے کے سلسلے میں اِدھر سے گذرنا تھا۔ گھنٹہ بھر کی فرصت تھی۔ میں نے کہا کہ آپ کی دعائیں لیتا جاؤں۔

میں نے اس سے جنگ کے حالات پوچھنے شروع کئے۔ اس نے تھوڑی دیر تک باتیں کیں اور پھر اجازت مانگی۔ میں اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تو اس نے کہا کہ آپ نے مجھے دعا تو دی نہیں۔ میں نے کہا کہ بیٹا! تمہیں کیا دعا دوں! اس نے کہا۔

میں دو محاذوں پر جا چکا ہوں۔ اور دونوں سے زندہ واپس آگیا ہوں۔ میں شوقِ شہادت سے تڑپ رہا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اب کے محاذ میں مجھے شہادت نصیب ہو جائے۔

میں اس کے سامنے ساکت و صامت کھڑا تھا۔ مجھ میں ایک لفظ تک بولنے کی ہمت نہ تھی۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کا ماتھا چوما۔ اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بمشکل اتنا کہہ سکا کہ

میرے عزیز! میری سو جانیں تم پر فدا ہوں۔ تم میری دعاؤں کے محتاج نہیں۔ میں تمہاری دعاؤں کا محتاج ہوں۔ یاد رہے تو محاذ پر میرے حق میں دعا کرنا۔

وہ پیچھے ہٹا۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے گرمجوشی سے دبایا۔ فوجی سلام کیا۔ اور آہستہ آہستہ لیکن پختہ قدم اٹھاتا واپس چلا گیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ اس وقت تک میرے کانوں میں آرہی ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

(پرویز)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اقبالؒ نے کہا تھا۔

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عشق کیا ہے؟ ایک بلند و بالا، مبنی بر صداقت، مقصد کے حصول کے لئے جانفروشانہ جدوجہد اور خود فراموشانہ سعی و عمل۔ ہم نے اس عشق کی داستانیں، لاہور اور کھیم کرن کے میدانوں۔ چھمب اور راجوڑی کی وادیوں فاضلکا اور راجستھان کے ریگ زاروں پر خون کے حروف سے لکھی دیکھی ہیں۔ ہم نے اس کے نعرۂ مستانہ کی صدائے بازگشت کوہ شکن توپوں کی گھن گرج، فیل تمثال ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ اور آتش بار طیاروں کی چنگھاڑ میں سنی ہیں۔ ہم نے تیشۂ فرہاد کے افسانے سن رکھے تھے، لیکن اب اس کی خارا شگافی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ ہم پڑھا کرتے تھے کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از وفورِ عشق
سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر ست

اور اس سے صرف ذہنی لذت لیا کرتے تھے۔ لیکن اب ہم نے اس سودائے عشق کو سامانِ صد ہزار کے برابر ہوتے اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔

عام تصور کے مطابق، عشق کی یہ بے پناہ قوتیں، شدتِ جذبات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا پیغام یہ ہے کہ: اس قسم کے وفورِ جذبات میں بھی فکر و بصیرت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ حتیٰ کہ وہ عین میدانِ جنگ میں بھی ـــ جبکہ شدتِ جذبات کی تلاطم انگیزیاں اپنی انتہائی طغیانیوں پر ہوتی ہیں ـــ عقل و فکر کو ہم عنان رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ جب بدر کے میدان میں قریش مکہ کو شکست ہوئی تو وہ سوچنے بیٹھے کہ ان کی اس ناکامی کے اسباب کیا تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ لوگ، اپنی شکست کے علل و وجوہ کی تلاش میں، ادھر ادھر تو جھانکیں گے لیکن اصل حقیقت پر ان کی نگاہ نہیں جائے گی۔ ان کی شکست کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۸/۶۵)۔ یہ لوگ، جذبات کے سیلاب میں اندھا دھند بہ جاتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

لہٰذا، آج جبکہ ہماری قوم، وفورِ جذبات کی کیف باریوں سے اس قدر سرشار ہو رہی ہے، اشد ضروری ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے ـــ بلکہ یوں کہئے کہ یہ اشد ضروری ہے کہ ہم اس امر کا ساتھ کے ساتھ جائزہ لیتے جائیں ـــ کہ جذبات کے اس سیلاب میں، کسی مقام پر قرآنی فکر کا دامن تو ہمارے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے جاتا؟

جنگ کے سترہ دنوں میں، اور اس کے بعد اس وقت تک، ملک کی ساری فضا اس قسم کے خیالات سے معمور ہے؛ اور ہر زبان بے ساختہ اس قسم کے الفاظ دہرا رہی ہے کہ ہمیں جس قدر کامیابی ہوئی ہے تائید غیبی تھی۔ یہ محض خدا کا فضل و کرم تھا۔ اس میں ہماری کوششوں کا کوئی دخل نہیں۔ خدا نے ہماری امداد اس لئے کی ہے کہ ہم حق پر تھے۔ ہم مظلوموں کی حمایت کے لئے اٹھے تھے۔ ہم حق و صداقت کا علم بلند کرنے کے لئے اٹھے تھے۔ اور جو حق کا علم بلند کرنے کے لئے اٹھتا ہے اسے دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔

خدا کی تائید اور اس کے فضل و رحمت سے انکار کوئی کافر ہی کر سکتا ہے۔ لیکن سمجھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ خدا کی تائید کہتے کسے ہیں اور یہ حاصل کن لوگوں کو ہوتی ہے۔ خدا نے اس کارگہ اسباب و علل میں ہر بات کے لئے ایک قانون مقرر کر رکھا ہے۔ جو شخص اس قانون کی اطاعت کرتا ہے اس کی کوشش صحیح اور خوشگوار نتائج مرتب کرتی ہے۔ اسے خدا کی تائید اور اس کی رحمت کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں خدا کے فضل و رحمت کو متعدد مقامات پر کھیتی (زراعت) کی مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ زراعت کے لئے خدا نے کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ جو کسان ان قوانین کے مطابق، اپنی زمین تیار کرتا ہے، اس میں عمدہ قسم کا، قابلِ نشو و نما بیج ڈالتا ہے۔ وقت پر پانی دیتا ہے۔ کھیتی کی حفاظت کرتا ہے۔ اسے ایک ایک دانے کے عوض سات سات سو دانے حاصل ہو جاتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ خدا کے اس فضل و رحمت سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ

جب انسانی کوششیں، قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوں، تو ان کے

فطری نتائج، خدا کی تائید و رحمت کے محسوس پیکر ہوتے ہیں۔

خدا کی تائید و رحمت کے لئے انسانی کوشش بنیادی عنصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے تعالیٰ — جس کے ایک ارادے سے یہ تمام سلسلۂ کائنات عدم سے وجود میں آگیا اور جس کی قدرتِ مطلقہ اپنے کسی پروگرام کی کامیابی کے لئے اسباب و ذرائع کی محتاج نہیں — حق و صداقت کی علمبرداری اور مظلوموں کی حمایت و حفاظت کے لئے انسانوں کو اٹھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے اپنا پروگرام (سنت اللہ) ہی یہ رکھا ہے کہ انسانوں کی دنیا میں یہ کام خود انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پائیں۔ آپ قرآن کریم کے گوشے گوشے میں اس قسم کی آیات پائیں گے کہ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (۲/۲۵۱)۔ اگر خدا انسانوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں، دراز دست انسانوں کی مدافعت کا انتظام نہ کرے، تو دنیا میں فساد ہی فساد دکھائی دے — اور اس کے بعد ہے۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ چونکہ خدا نے نوع انسان پر اپنا "فضل" کرنا ہے اس لئے اس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ خدا کا فضل کس طرح انسانی دست و بازو کے ذریعے ظہور میں آتا ہے!

اور دیکھئے۔ مکہ کے کمزور اور ناتواں مسلمان، قریش مکہ کے استبداد اور مظالم کا تختۂ مشق بن رہے ہیں۔ انہیں قسم قسم کی تکالیف پہنچائی جا رہی ہیں۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ (مسلمان) حق و صداقت پر بھی ہیں۔ اور مظلوم بھی ہیں۔ حق و صداقت پر قائم رہنے والوں کی حفاظت اور مظلوموں کی امداد، کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے۔ لیکن خدا ان کی براہ راست مدد نہیں کرتا۔ جب وہ مدد کے لئے خدا کو پکارتے ہیں تو خدا، مدینہ کے مسلمانوں کو (جو اب اس قابل ہیں کہ استبداد کا مقابلہ کر سکیں) کہتا ہے کہ

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۴/۷۵)

اے مسلمانوں! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ (کیا تم سنتے نہیں ہو کہ مکہ) کے کمزور و ناتواں مسلمان — مرد، عورتیں بچے۔ کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ہمیں کسی طرح اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے۔

(ہمارا یہاں کوئی حفاظت کرنے والا اور مددگار نہیں) تو اپنے ہاں سے ہمارے لئے کسی محافظ اور مددگار کا انتظام کر دے۔

چنانچہ ان کی حفاظت اور نجات کا انتظام، مدینہ کے ان مسلمانوں کے دست و بازو اور شمشیر و سناں نے کیا۔ اور اس کا نام قتال فی سبیل اللہ قرار پایا۔

(چونکہ ہم نے اس نکتہ کو ایک مقالہ میں، جو چند صفحات بعد آپ کے سامنے آئے گا زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے، اس لئے اس مقام پر اپنی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے، آپ اس مقالہ کا اس اجمال کی تفصیل کے طور پر مطالعہ فرمائیں)۔

جذبات کے اسی ہجوم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم پر جو مصیبت بھی آتی ہے خدا کی طرف سے آتی ہے۔ اس لئے ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے۔ یہ تلقین قرآن کریم ہی کی ایک آیت پر مشتمل ہے لیکن اسے بڑے غلط پیرایہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کا صحیح مفہوم سامنے نہ لایا جائے تو اس سے ایک بنیادی غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ جس کے نقصانات بڑے دور رس ہو سکتے ہیں۔

"قانونِ مکافاتِ عمل" دین کا بنیادی اصول ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زندگی کی خوشگواریاں ہوں یا مصائب یہ سب انسان کے اپنے کاموں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کس قدر واضح ہے قرآن کریم کا یہ اعلان کہ

وَ مَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰)

جس حادثہ سے بھی تم دوچار ہوتے ہو۔ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔

جب جنگ اُحد میں، فوج کے ایک دستہ کی غلطی سے، مسلمانوں کو شکست ہوئی تو وہ سوچنے لگے کہ اَنّٰى هٰذَا یہ مصیبت کہاں سے آ گئی۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ خدا نے اپنے رسول سے کہا کہ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (۳/۱۶۵)۔ ان سے کہدو کہ یہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ہے۔ کہیں اور سے نہیں آ گئی۔ ان (اور ان جیسے کئی اور) مقامات سے واضح ہے کہ مصیبت خدا کی طرف سے نہیں آتی۔ وہ انسانوں کی اپنی ہی غلطیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ وہ خواہ مخواہ انسانوں پر مصیبت لاتا رہے۔ جو شخص یہ تعلیم دیتا ہے کہ مصیبت یونہی بیٹھے بٹھائے خدا کی طرف سے آجاتی ہے، وہ نہ صرف خدا کی (معاذ اللہ) توہین کرتا ہے بلکہ قوم کو ایک ایسے غلط راستے پر ڈال دیتا ہے جس سے وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح یا اپنی کمی اور کوتاہی کا ازالہ کر ہی نہیں سکتی۔ ایسے لوگ دین و دانش دونوں کے رہزن ہوتے ہیں۔ ان سے

کوئی پوچھے کہ اگر مصیبت بلا سبب خدا کی طرف سے آتی ہے تو مصیبت کے دور کرنے کے لئے جو تدابیر اختیار کی جاتی ہیں وہ خدا سے لڑائی مول لینے کے مرادف ہے۔ یعنی خدا مصیبت کو بھیجتا ہے اور انسان مصیبت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، یہ خدا کے خلاف نبرد آزمائی نہیں تو اور کیا ہے۔

اب آئیے اس مقام کی طرف جس کے غلط مفہوم سے یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ مصیبت ــــ خدا کی طرف سے آتی ہے۔ اس کا ذمہ دار انسان خود نہیں ہوتا۔ سورۂ نساء میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر انہیں کامیابی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور اگر ناکامی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار رسولؐ ہے۔ اس کے جواب میں کہا کہ ان سے کہدو کہ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۴/۷۸)۔ یہ سب (کامیابی اور ناکامی) "خدا کی طرف سے" ہوتی ہے۔ "خدا کی طرف سے" ہوتی ہے کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ جب تم خدا کے قوانین کے مطابق عمل کرتے ہو تو اس کا نتیجہ خوشگواری اور کامرانی ہوتا ہے ــــ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ــــ لیکن جب تم اس کے قانون کے خلاف، اپنی مرضی سے کچھ کرنے لگ جاتے ہو تو اس کا نتیجہ ناکامی اور مصیبت ہوتا ہے ــــ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۴/۷۹)۔ جہاں مصیبت کے باذن اللہ آنے کا ذکر ہے (۳/۱۶۶) یا جہاں کہا گیا ہے کہ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (۹/۵۱) تو اس سے بھی یہی مراد ہے کہ مصیبت خدا کے قانون کی خلاف ورزی سے آتی ہے۔ جب جنگ احد اور جنگ حنین میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو قرآن کریم نے ان سے یہ نہیں کہا کہ یہ مصیبتیں خدا کی طرف سے آئی ہیں اس لئے تم انہیں خاموشی سے برداشت کرلو۔ خدا نے انہیں بتایا کہ تم سے لغزش اور غلطی ہوئی جس کی وجہ سے یہ شکست ہوئی۔ جب ان غلطیوں کا ازالہ کرلیا گیا تو شکست مبدل بہ فتح ہوگئی۔

لہٰذا، قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی تائید و نصرت۔ انسانی کوششوں کے خدا کے قوانین سے ہم آہنگ ہونے کے فطری نتائج کا دوسرا نام ہے۔ اور جب انسان ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس سے اس پر مصیبت آجاتی ہے ــــ یاد رہے کہ خدا کے قوانین میں، طبیعی قوانین اور اخلاقی قوانین دونوں شامل ہیں۔

ایک نعرہ یہ بھی بلند کیا جاتا ہے کہ دیکھ لو! ہمیں بالآخر اسلام ہی نے بچایا۔ قوم نے جو کچھ کیا، اسلام کے لئے کیا۔ اسلام کی وجہ سے کیا۔ اس لئے اب قوم کو اسلام کی طرف آجانا چاہیئے۔

نعرہ یہ بھی صحیح ہے لیکن جس مقصد کو سامنے رکھ کر اسے بلند کیا جا رہا ہے، وہ بڑا خطرناک ہے۔ پاکستان میں وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کی بھرپور مخالفت کی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس تحریک میں

قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں اسلام کی ہوا تک بھی نہیں لگی۔ پاکستان، ان کی مخالفت کے علی الرغم وجود میں آگیا تو انہوں نے یہ نعرہ بلند کرنا شروع کر دیا چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے مملکت کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جو (بزعم خویش) اسلام کے اجارہ دار ہیں۔ ان لوگوں نے اٹھارہ برس تک مسلسل، اس نعرہ کی تقدیس کی اوٹ میں، ملک کو جس خلفشار میں مبتلا رکھا ہے، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان لوگوں کی ہوس اقتدار کی تخریبی کوششیں راستے میں حائل نہ ہوتیں، تو تعمیری اعتبار سے آج پاکستان کچھ کا کچھ ہوتا، اور کبھی کا صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بن چکا ہوتا۔ یہ لوگ بڑے موقعہ پرست ہیں۔ اب جنگ کی وجہ سے جو لوگوں کے جذبات ابھرے (خطرہ کے وقت انسان خدا کو زیادہ یاد کرنے لگ جاتا ہے) تو ان لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور وہی اپنا پرانا نعرہ بلند کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو! یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہوا ہے۔ اس لئے اب بھی اس بات کو سمجھو کہ اگر ملک کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو "اسلام کے نام لیوا" ہیں، تو قوم کیا کچھ کر کے نہیں دکھا دے گی؟

اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ پاکستان اسلام کی جولانگاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو گا جب یہ صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس چیز کا نام ان لوگوں نے "اسلام" رکھ چھوڑا ہے، کیا پاکستان اس کے لئے حاصل کیا گیا تھا، اور کیا اس کے اجراء سے پاکستان اسلامی مملکت بن جائے گا؟ یاد رکھئے! جس چیز کو یہ لوگ اسلام کہہ کر پیش کرتے ہیں، نہ وہ اسلام ہے۔ نہ پاکستان کو اس اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اور نہ ہی اس کے اجراء سے پاکستان اسلامی مملکت بن سکتا ہے؟ وہ خالص تھیاکریسی ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا اور انسانیت کو جس لعنت سے چھڑانے کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا۔ انسانیت کی تاریخ شاہد ہے کہ تھیاکریسی (مذہبی پیشوائیت کے اقتدار) نے کبھی انسان کو سکھ کی نیند سونے نہیں دیا۔ خود ہمارے زمانے کی تاریخ بتا رہی ہے کہ جس جس ملک میں، تھیاکریسی کے علمبرداروں نے جماعتی قوت حاصل کی ہے، وہاں کس قدر خلفشار پیدا ہوتا رہا ہے۔ یہی وہ "اسلام" ہے جس کا اقتدار یہ لوگ یہاں چاہتے ہیں۔

اس مقام پر ہم ان حضرات سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ اس وقت جن جانباز فوجیوں نے پاکستان کو بچایا ہے۔ جن کی معرکہ آرائیوں کو دیکھ کر آپ خود پکار اٹھے ہیں کہ انہوں نے عہد صحابہؓ کی یاد تازہ کرا دی۔ جن کی زندگی کو آپ مجاہدین کی زندگی، اور جن کی موت کو آپ شہادت قرار دے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے یہ نوجوان اس اسلام کے پابند تھے جس کی برکات سے (آپ کہہ رہے ہیں کہ) یہ سب کچھ ہوا؟ آپ تو ان کی زندگی کو یکسر غیر اسلامی قرار دیتے تھے۔ آپ ان میں

مسلسل کیڑے ڈالتے چلے آرہے تھے۔ آپ نے ان کے خلاف نفرت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ پھر یہ کیا ہے کہ اب ان کی زندگی آپ کے نزدیک مجاہدین کی زندگی اور ان کی موت شہدار کی موت قرار پا رہی ہے؟ سنئے کہ انہوں نے اس قدر محیر العقول کارنامے کس طرح کر دکھائے۔ ان کی زندگی کس طرح مجاہدین کی زندگی اور ان کی موت کس طرح شہدار کی موت ہے۔ سنئے اور غور سے سنئے کہ یہ سب کچھ خدا کے ان احکام و قوانین کی اطاعت کی وجہ سے ہوا جن کی رُو سے اس نے کہا ہے کہ

(۱) جنگ کے لئے اٹھو تو ہوس ملک گیری یا کمزوروں کو مغلوب کرنے کے لئے نہ اٹھو۔ مظلوموں کی مدد کے لئے اٹھو۔ کمزوروں کو ان کا حق دلانے کے لئے اٹھو۔ (۴/۷۵)۔

(۲) اپنی سرحدوں کو پوری طرح مضبوط رکھو۔ (۸/۶۰)۔

(۳) میدان جنگ میں پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ اٹھو۔ اگر ایسا کرو گے تو سیدھے جہنم میں جا گرو گے۔ (۸/۱۶)

(۴) سخت سے سخت خطرہ کے وقت بھی اپنے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دو۔ تم ثابت قدم رہو گے تو اپنے سے دس گنا فوج پر بھی غالب آجاؤ گے۔ (۸/۶۵)۔

(۵) اپنے اندر اختلاف اور تنازعہ نہ پیدا ہونے دو، ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (۸/۴۶)۔

(۶) اس حقیقت پر یقین رکھو کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں۔ یہ مسلسل آگے چلتی ہے۔ موت سے حیوان مرتا ہے۔ یعنی انسان نما حیوان — انسان — یعنی حق و صداقت کی خاطر جان دینے والا، نہیں مرتا۔

(۷) اور سب سے بڑی بات یہ کہ میدان جنگ میں بلند اخلاقی اقدار کا احترام کرو (۸/۴۵) — (اس وقت تک جنگ کی جس قدر خبریں شائع ہوئی ہیں، ان میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا سامنے نہیں آیا جس میں ہمارے ان قابل فخر نوجوانوں نے، دشمن کے مفتوحہ علاقہ سے ایک سوئی تک بھی ناجائز طور پر اٹھائی ہو۔ مفتوحہ شہری آبادی کو ہدف ظلم و ستم بنایا ہو یا کسی عورت کی طرف بری نظر سے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو)۔

ہمیں تسلیم ہے کہ ان نوجوانوں کی زندگی معصوم فرشتوں کی سی نہیں تھی۔ قوم کے عام نوجوانوں کی سی لاابالی زندگی تھی۔ اس میں منکرات بھی متصیں اور مناہی بھی۔ اور منکرات و مناہی بہرحال خرابیاں ہیں اور اسلام میں مبغوض۔ ان سے پرہیز لازمی ہے۔ ہم کسی صورت میں بھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے نہ ہی کسی کو ان کی کھلی چھٹی دی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم کہتا یہ چاہتے ہیں کہ ایسا کرنے والے بہرحال مجرم قرار پاتے ہیں

راندۂ درگاہ نہیں ہو جاتے۔ اگر وہ کبائر سے بچتے ہیں تو اس قسم کی "لمم" قابل معافی قرار پا جاتی ہیں (۵۳/۳۲)۔ اگر کسی کی حسنات کا پلڑا بھاری ہے تو اس سے اس کی سیأت، کے نقصانات کی تلافی ہو جاتی ہے۔ (اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ۱۱/۱۱۴)۔ لیکن ہمارے ہاں کے دین کے اِن اجارہ داروں کا اسلام اس سے مختلف ہے۔ ان کے اسلام کی رُو سے، جو شخص ان کا ہم خیال ہے اور ہم شبیہہ، وہ مومن حقا ہے خواہ اسے انسانی اقدار کی ہوا تک بھی نہ چھو گئی ہو ---- انسانی اقدار کا ان کے ہاں تصوّر ہی نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک، حسنات ایک خاص قسم کی وضع قطع، اور چند ظواہر و رسوم کی میکانکی پابندی کا نام ہے ---- اور جو شخص ان کے ٹولے میں شامل نہیں یا ان سے متفق الخیال نہیں وہ ملحد و بے دین ہے اور ان کی حکومت میں، ایک سال کے نوٹس کے بعد، واجب القتل۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے دل کی گہرائیوں میں اسلام کی محبت بڑی شدید ہے۔ اور نازک لمحات میں وہ محبت بڑے بڑے معجزے کر کے دکھا دیتی ہے یہ بڑی قابلِ فخر متاع ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اِس وقت جو اسلام کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے اس کے پیچھے ایک سیاسی مقصد چھپا ہوا ہے جس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ ہنگامی خطرہ تو بعونہٖ تعالیٰ ٹل جائے گا لیکن اس کے بعد یہ مستقل خطرہ پھر ہمارے گلوگیر ہو جائے گا۔ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ہمیں کسی خارجی دشمن کے ہاتھوں اتنا نقصان نہیں اٹھانا پڑا جتنا نقصان ان لوگوں کے ہاتھوں اٹھانا پڑا جو اسلام کا نام (EXPLOIT) کرتے ہیں۔ حَیْثُ اَتیٰ۔ (وہ کوئی بھی ہوں، اور کسی سمت سے بھی آئیں)۔

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ اقوامِ عالم کے پیش نظر "وطن" سے بلند کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہی ان کی امیدوں کا مرکز اور ان کی تمناؤں کا محور ہوتا ہے۔ اسی کی خاطر وہ جیتے اور اسی کی خاطر مرتے ہیں۔ اسی کے نام پر وہ قوم کے جذبات کو مشتعل کرتے اور اسی کے تحفظ کے لئے وہ ان سے قربانیاں مانگتے ہیں۔ موجودہ مغربی سیاست نے، وطن کو ایک دیوتا کی حیثیت دے رکھی ہے جس کی پرستش قوم کا ہر فرد کرتا ہے۔ یہ اس لئے کہ مادی نظریۂ حیات کی رو سے طبیعی وجود (PHYSICAL EXISTENCE) سے بلند کوئی مقصد ہی نہیں، اور چونکہ اس کے لئے "وطن" ناگزیر ہے، اس لئے ان کے نزدیک، وطن ہی زندگی کا منتہائے مقصود ہے۔

لیکن اسلام کے نزدیک، وطن کی دو حیثیتیں ہیں۔ اس کی ایک حیثیت تو اس خطۂ زمین کی ہے جس کے

استحکام کے ساتھ، اُس خطۂ زمین کے اندر رہنے والوں کی جان، مال — عزت، ناموس کی حفاظت وابستہ ہے۔ اس کی یہ حیثیت ایک صندوق کی سی ہے جس کے اندر آپ نے اپنی قیمتی اشیاء رکھی ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان قیمتی اشیاء کی حفاظت کے لئے، صندوق کی ضرورت بھی ہے، اور اس کا مضبوط ہونا بھی ازبس ناگزیر ہے۔ ایسا انتظام بھی ضروری ہے جس کی رو سے یہ صندوق ہر دراز دست کی دستبرد سے محفوظ رہے۔

اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ ہمارے دین کے تقاضوں کے پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دین نام ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان قوانین کے مطابق زندگی، ایک آزاد خطۂ زمین ہی میں بسر کی جاسکتی ہے۔

وطن کی پہلی حیثیت وہ ہے، جس میں، ایک مسلمان اور دنیا کی دیگر اقوام میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (اگرچہ اس حیثیت میں بھی، مسلمان، ایک دیوتا کی طرح وطن کی پرستش نہیں کرتا۔ اسے خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے) لیکن وطن کی دوسری حیثیت وہ ہے جس میں مسلمان، منفرد ہے۔ وطن کی پہلی حیثیت، محض آدمی کی سطح کا تقاضا ہے۔ اس کی دوسری حیثیت مسلمان آدمی کی سطح کی ضرورت۔ پہلا تقاضا آدمیت کا ہے۔ دوسرا انسانیت کا — اور یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان، آدمی بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر آدمی انسان بھی ہو۔ قرآن کی رو سے، انسانیت کی زندگی مومن ہی کے حصے میں آتی ہے۔ غیر مسلم جب وطن کی حفاظت چاہتا ہے تو اس سے وطن کی پہلی حیثیت کا تحفظ مقصود ہوتا ہے۔ لیکن جب مسلمان، وطن کی حفاظت کا متمنی ہوتا ہے تو اس سے، وطن کی دونوں حیثیتوں کا تحفظ مقصود ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ابھار کر سامنے لانے کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم اپنے وطن کی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم بنائے رکھو تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸/۶۰) تاکہ اس سے ان لوگوں کے دل پر خوف طاری رہے جو "تمہارے بھی دشمن ہیں اور خدا کے بھی دشمن"۔ "تمہارے دشمن" سے وطن کی پہلی حیثیت سامنے آتی ہے، اور "خدا کے دشمن" سے دوسری حیثیت۔ مسلمان کے نزدیک، یہ دونوں حیثیتیں، ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جاسکتیں۔ اس لئے کہ اس کا دعوٰے یہ ہے کہ

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے
غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

جام کی گردش کے لئے ساقی کا رہنا ضروری ہے۔ اور ساقی، اس وقت تک ساقی ہے جب تک جام موجود ہے۔ پاکستان کے حصول میں اس کی یہ دونوں حیثیتیں سامنے تھیں۔ اور اب اس کی حفاظت اور استحکام

کے لئے بھی اس کی یہ دونوں حیثیتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔

لیکن ہم نے دیکھا یہ ہے کہ پچھلے دنوں یہاں پاکستان کے تحفظ کے لئے جس قدر آوازیں بلند ہوئیں ان میں، پاکستان کی پہلی حیثیت زیادہ نمایاں رہی ـــــ مقررین کی تقریروں میں، محررین کی تحریروں میں، شاعروں کے اشعار میں، ریڈیو کے ترانوں میں۔ "وطن" کا نام بار بار آیا، لیکن قرآن کا نام بہت کم آیا ـــــ مثلاً

وطن ہے ہمارا وطن کے ہیں ہم ۔۔۔ یہی دھن ہے جب تک کہ ہے دم میں دم
وطن کی محبت میں دل شاد ہے ۔۔۔ غلامی کی بندش سے آزاد ہے
اے وطن۔ میرے وطن۔ پیارے وطن ۔۔۔ کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن
میں اپنے وطن کا سپاہی بنوں گا.....
تم اپنے وطن کی حفاظت کو جاؤ ـــــ اپنے وطن کو بچاؤ

اگر ہم صرف "وطن" تک محدود رہیں گے اور قرآن کا نام نہ لیں گے، تو ہم میں اور دوسری قوموں میں کوئی فرق نہیں رہے گا ـــــ اور اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ آپ پاکستان کے ریڈیو سے مندرجہ بالا نغمے اور ترانے سننے کے بعد جب جالندھر ریڈیو پر سوئی لے جائیں گے تو بعینہٖ یہی الفاظ آپ کو وہاں سے سنائی دیں گے۔ حتّٰی کہ جب آپ نے اپنے ہاں کے ان سپاہیوں کو جنہوں نے اس معرکہ میں جان دی فی شہید وطن کہہ کر پکارا، تو ہندوؤں نے اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جان دینے والے نائیک عبدالحمید کو شہید وطن قرار دے کر، ملک کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا۔ یاد رہے کہ قتال فی سبیل اللہ ہو یا قتال فی سبیل الطاغوت، وطن کی حفاظت و استحکام کا جذبہ دونوں میں مشترک ہوتا ہے۔ لیکن جو چیز قتال فی سبیل اللہ کو قتال فی سبیل الطاغوت سے متمیز کرتی ہے، وہ یہ جذبہ ہے کہ وطن کی حفاظت اس لئے ضروری ہے کہ یہ ہماری جان، مال، عزت، آبرو کا محافظ اور ہماری اجتماعی قوت کا مرکز ہے، اور ہماری جان، مال، عزت اور قوت کا تحفظ ضروری ہے تاکہ یہ مستقل اقدارِ خداوندی کی حفاظت اور تنفیذ کا ذریعہ بنیں۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶/۱۶۳) یہ ہے مسلمان کا صحیح نعرہ۔ اور یہی نعرہ ہمیں بلند کرنا چاہیئے۔

ہم ملک کے مقررین، محررین، شعراء اور خطباء سے گذارش کریں گے کہ وہ اپنی تقریروں، تحریروں، شعروں اور خطبوں، گفتگوؤں اور مذاکروں میں اس بنیادی نکتہ کو پیشِ نظر رکھیں اور وطن کی جگہ قرآن کی حفاظت قوم کا مقصود و منتہیٰ قرار دیں اور وطن کا تصور اس حیثیت سے پیش کریں کہ یہ قرآنی نظام کی آماجگاہ بننے کے لئے

وجود میں لایا گیا ہے اور اسی لئے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ اس (بظاہر) ذراسی تبدیلی سے، ہماری تمام کوششوں اور قربانیوں کے قبلہ نما کا رُخ، جانبِ قبلہ ہو جائے گا۔ وَ فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ۔

جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا، ہم ۵ ستمبر کی شام کو سوئے تو کسی اور قوم کے فرد تھے اور ۶ ستمبر کی صبح کو بیدار ہوئے تو وہ کوئی اور ہی قوم تھی۔ قوم کی یہ قلبِ ماہیت اور محیر العقول تبدیلی کس طرح ہوئی، یہ وہ سوال ہے جو ہم میں سے ہر ایک کی زبان پر ہے۔ لیکن اس کا اطمینان بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب چنداں مشکل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں، اس اٹھارہ برس میں، افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے، قوم کی حیثیت سے نہیں رہ رہے تھے۔ قوم (یا ملت) کسے کہتے ہیں، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ کہا ہے اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں،

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اسے اور سمجھا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وحدتِ مقصد سے افراد، قوم بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جیسے گول کے سامنے ہونے سے، کھلاڑی ٹیم بن جاتے ہیں۔ "وحدتِ مقصد" یہ ہے، وہ سمنٹ جس سے افراد کے منتشر ذرات، ایک محکم چٹان میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ "وحدتِ مقصد" کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد اسے علیٰ وجہ البصیرت محسوس کرے کہ اس مقصد کے حاصل ہونے میں میرا فائدہ ہے اور اگر یہ حاصل نہ ہوا تو اس سے میرا نقصان ہوگا۔ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں اسی ہم مقصدی سے، یہ منتشر افراد ایک قوم بن گئے تھے۔ اُس وقت ہر فرد نے محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان بننے میں میرا فائدہ ہے۔ تقسیمِ ملک کے قیامت خیز ہنگاموں کے وقت، اور اس کے تھوڑا عرصہ بعد تک، ہم، ایک قوم تھے، کیونکہ اُس وقت ہم میں سے ہر فرد نے محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان کے کمزور ہو جانے میں اس کا اپنا نقصان ہے۔ لیکن اس کے بعد (جب یہ خطرہ جاتا رہا۔ یا یوں کہئے کہ ہم نے یہ جھوٹا اطمینان پیدا کر لیا کہ اب پاکستان کو کوئی خطرہ نہیں) تو ملک میں نظام اس قسم کا رائج ہو گیا جس میں پاکستان کے مفاد سے عملی مفہوم، چند افراد، چند خاندانوں یا چند گروہوں کا مفاد ہو گیا۔ اور عوام کو محسوس ہونے لگا کہ جس چیز کو ملک یا قوم کا مفاد کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت چند مخصوص افراد کا مفاد ہے۔ اس مفاد میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔ ہمارا مفاد اسی میں ہے جو ہمارے حصے میں آجائے۔ اس سے ملک میں ہر طرف، افراتفری، اور نفسا نفسی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ہر فرد کو اپنے اپنے ذاتی مفاد کی فکر لاحق ہو گئی۔ جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا اس نے سمیٹنا شروع کر دیا۔ اگر کسی سے کہا جاتا کہ بھائی! جو کچھ تم کر رہے ہو، اس میں تمہارا ایک پیسے کا

فائدہ ہے اور قوم کا ایک روپے کا نقصان، تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ قوم کے نقصان سے اس کا کیا تعلق ہے۔ وہ اپنے فائدے کو اپنا فائدہ، اور قوم کے نقصان کو دوسرے کا نقصان سمجھتا تھا، اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا تھا کہ مجھے دوسروں کے نقصان کی کیا پڑی ہے جو میں اپنا فائدہ چھوڑ دوں! اس ذہنیت کا رونا ہم سب روتے تھے، لیکن اس کا مداوا کوئی نہیں سوچتا تھا۔ اس لئے کہ اس کا مداوا تھا ملک میں ایسا نظام قائم کرنا جس میں ہر فرد علی وجہ البصیرت محسوس کرے کہ قوم کا فائدہ درحقیقت اس کا اپنا فائدہ ہے اور قوم کا نقصان اس کا اپنا نقصان۔

ہر ستمبر کی صبح کو ملک یکایک اس قسم کے مہیب خطرہ سے دوچار ہو گیا جس میں ہر فرد نے محسوس کیا کہ یہ خطرہ اس کے اپنے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اگر (خدانخواستہ) ملک کمزور ہو گیا تو اس کا اپنا سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس لئے اُسے، اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرنا چاہیئے۔ یوں افراد کے سامنے وحدتِ مقصد آ گیا، اور اس وحدتِ مقصد سے افراد، پھر ایک قوم کے قالب میں ڈھل گئے۔ پھر منتشر ذرّے چٹان بن گئے کہ خطرات کی موجیں اٹھیں تو اس سے اپنا سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔

لیکن خطرات کی پیدا کردہ وحدتِ مقصد تو منفیانہ عمل ہے۔ اوّل تو خطرہ، ہنگامی ہوتا ہے اس لئے خطرہ کی پیدا کردہ وحدت، پائیدار نہیں ہو سکتی۔ (اگر خطرہ طول کھینچ جائے تو وہ بالعموم زندگی کا معمول بن جاتا ہے، اور اس سے خوف کی شدت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح بھی خطرہ سے ابھری ہوئی وحدت، رفتہ رفتہ محلول ہو جاتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اتنا ہی نہیں ہوتا کہ افراد میں اجتماعی مفاد کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے جو ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اس سے انفرادی مفاد پرستی پہلے سے بھی زیادہ شدید شکل میں ابھرتی ہے۔ جیسا کہ یہاں ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا۔ پائیدار وحدت ہمیشہ مثبت بنیادوں پر اٹھتی ہے۔ اور اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ملک میں ایسا نظام رائج کیا جائے جس میں ہر فرد نہ صرف یہ محسوس کرے کہ ملت کے اجتماعی مفاد میں اس کا برابر کا حصہ ہے، بلکہ اسے اس حقیقتِ کبریٰ پر بھی ایمان ہو کہ اس کی عاقبت کی نجات و سعادت بھی ان اعمال سے وابستہ ہے جو انسانیت کی فوز و فلاح کے لئے سرزد ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نظام، قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدارِ انسانیت کی بنیادوں ہی پر استوار ہو سکتا ہے۔ قرآن کو اپنے آئین کی بنیاد بنایئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح، زندگی کے ہر گوشے میں، پوری کی پوری جماعت، امام کی ایک آواز پر اٹھتی اور ایک آواز پر جھکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ہم دو ایک ضمنی باتوں کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ قوم نے دفاعی فنڈ کے سلسلہ میں جس گرم جوشی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ مظاہرہ یقیناً قابلِ فخر ہے لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات

نہیں۔ یہ اسی وحدتِ مقصد کا فطری نتیجہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس فنڈ میں اس سکون و ثبات سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے میں اس حقیقت کا بھی بڑا دخل ہے کہ عطیات دینے والوں کو اس کا یقین ہے کہ ان میں کہیں خرد برد نہیں ہوتی اور ہر پیسہ اور ہر شے صحیح مقام تک پہنچ رہی ہے۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ ملک میں چھپ چھپ کر پھرنے والا غدار طبقہ قوم کے اس اعتماد میں کھٹک اور خلش پیدا کر دینے کے درپے ہے۔ چنانچہ اس قسم کے وساوس پھیلائے جا رہے ہیں کہ ان عطیات میں خیانت ہو جاتی ہے۔ اس وسوسہ اندازی کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ملک کے طول و عرض میں، لوگوں نے انفرادی طور پر چندے جمع کرنے شروع کر دیئے ہیں اور انفرادی طور پر تحائف اکٹھے کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ہم ایسا کرنے والوں کی نیت پر شبہ نہیں کرتے لیکن اس سے اس وسوسہ انگیزی کے لئے میدان وسیع ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس تخریبی عنصر کی فتنہ جوئی کے سدباب کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ

(۱) جس جگہ بینک موجود ہیں، ہر بینک میں عطیات جمع کرانے کا انتظام کر دیا جائے۔

(۲) تحائف جمع کرنے کے لئے ملٹری کی زیر نگرانی جگہ بہ جگہ سنٹر کھولے جائیں۔ اور جس جگہ بینک نہ ہو، یہ سنٹر نقد عطیات بھی وصول کریں۔

اس کے بعد، احکام جاری کر دیئے جائیں کہ ملک میں کوئی شخص نہ اپنے طور پر چندہ جمع کرے اور نہ ہی تحائف وصول کرے۔ اس سے لوگوں کا اعتماد قائم رہے گا اور وساوس پیدا کرنے والے کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

ایک سوال یہ بھی زیر غور ہے کہ جن سعادتمند نوجوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا ہے ان کے شایانِ شان یادگار قائم کی جائے۔ یہ خیال بڑا مبارک ہے اس قسم کی یادگاریں، آنے والی نسلوں کے دل میں، جرأت اور قربانی کے جذبات بیدار کرنے کا موجب بنتی ہیں لیکن یادگار ایسی ہونی چاہیئے جس کا کوئی مصرف بھی ہو۔ بے کار ستون کھڑا کر دینا یا بے معنی سا مینار بنا دینا، ضیاعِ مال ہے۔ اس قسم کی یادگاریں قائم کرنے والوں کی قرآن کریم نے سرزنش کی ہے (۲۶/۱۲۸)۔ ہمارے خیال میں، ان شہداء کی بہترین یادگار، ایک ایسی درسگاہ کا قیام ہے جس میں قوم کے بچوں کو فوجی تربیت کے ساتھ قرآنی اقدار کی تعلیم دی جائے، اور ان معرکوں کی داستانیں ان کے نصاب میں داخل ہوں۔

اس وقت قوم کے سامنے ایک بڑا مسئلہ ان خانماں خراب خاندانوں کی بحالی کا ہے جن کے گھر بار گذشتہ جنگ میں اجڑ گئے۔ جو خالی ہاتھ، محض اپنی جانیں لے کر، دوسرے مقامات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ مسئلہ میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے سے کم اہم نہیں۔ یہ امر موجب صد اطمینان ہے کہ قوم نے ان بے سہارا ضرورتمندوں کی مدد کرنے میں بڑی کشادہ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ہنگامی نہیں۔ یہ ایک عرصہ دراز تک ہماری توجہات کا

کا مرکز رہے گا، لہٰذا، ہمیں اس کے حل کے لئے اسی نہج سے سوچنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں مادی اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کے لئے جو کچھ کیا جائے، اس سے کہیں اہم ایک نفسیاتی سوال ہے۔ ہم نے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد دیکھا ـــــ اور بدقسمتی سے اب پھر اس کا اعادہ ہو رہا ہے ـــــ کہ جو لوگ اس طرح اجڑ کر آتے ہیں ان سے ہم گداگروں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کی کچھ امداد کرتے ہیں تو اسی طرح جیسے بھکاریوں کی جھولی میں خیرات کے ٹکڑے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے اس انسانیت سوز اور ذلت آمیز سلوک کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ یہ اجڑے ہوئے شرفا خود اپنے آپ کو گداگر سے محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ انہیں اس ذہنی حالت تک پہنچانے کے ذمہ دار ہم ہوتے ہیں۔

لیکن ذرا سوچیئے کہ یہ "محتاج" جن سے ہم گداگروں کا سا سلوک کرتے ہیں، کون ہیں، اور ان میں اور ہم میں کیا فرق ہے۔ اسے مفروضوں کی بجائے واقعات کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ بیرونِ لاہور جلو کی نہر اور واہگہ کی سرحد کے درمیانی علاقہ میں، بہت سے گاؤں تھے جہاں کے رہنے والے، نہایت خوشحال اور باعزت افراد تھے۔ وہ بیسیوں کی مدد کرتے اور سینکڑوں کو کھلا کر کھانے کے قابل تھے۔ وہ اپنے اپنے گھروں میں آرام سے سو رہے تھے کہ ان پر دشمن کا اچانک حملہ ہوا اور قبل اس کے کہ ہماری فوج ان کی حفاظت کے لئے پہنچتی، ان کا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ معلوم نہیں ان میں سے کتنے وہیں ختم ہو گئے اور ان کا وہاں کیا کچھ لٹا۔ جو کسی طرح بچ بچا کر نکل آئے، وہ یہی "محتاج" ہیں۔ اس کے بعد دشمن آگے بڑھا، اور اس نے خود شہر (لاہور) کا رُخ کیا۔ لیکن اتنے میں ان کے سامنے ہماری جانباز فوج کی دیوار کھڑی ہو گئی اور وہ ہم تک نہ پہنچ سکا۔ یوں ہم تباہ ہونے سے بچ گئے۔ اگر (خدا نکردہ۔ خدا نکردہ) ہماری فوج دشمن کو بروقت نہ روک لیتی تو اس وقت ہماری حالت بھی ان ہی محتاجوں کی سی ہوتی ـــــ یہی کیفیت، دیگر مقامات سے اجڑ کر آنے والے محتاجوں کی ہے۔ اب آپ سوچ لیجئے کہ ہم میں اور ان میں کیا فرق ہے؟ اور اس کے بعد خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا عزت و شرف اور تعظیم و تکریم کے اعتبار سے، ان میں اور ہم میں کوئی بھی فرق ہو سکتا ہے۔ ـــــ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر، ہم سے زیادہ واجب التکریم اور مستحقِ تعظیم ہوں۔ لہٰذا، اگر ان کی مدد کرتے وقت، آپ کے دل میں اس امر کا ذرا سا خیال بھی گزرا کہ یہ ذلیل ہیں اور ہم ذی مرتبہ۔ یہ ہمارے محتاج ہیں اور ہم غنی۔ ہمارا ہاتھ اوپر ہے اور ان کا نیچے۔ تو یاد رکھئے، جو کچھ آپ انہیں دے رہے ہیں، اس کا اجر و ثواب تو ایک طرف رہا، آپ بارگاہ خداوندی میں ایسے سنگین جرم کے مجرم قرار پائیں گے جس کی سزا، دنیا کی ذلت اور عاقبت کی روسیاہی ہوگی۔ خدا نے آپ کے مال و دولت میں ان کا حق بتایا ہے (فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ؀) لہٰذا، جو کچھ آپ انہیں دیتے ہیں وہ ان کا حق

ہے خیرات نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اپنا حق وصول کرنے والا کبھی اگر نہیں ہوتا ـــــ اور ابھی تو جنگ جاری ہے۔ خدا ہر ایک کو اپنی حفاظت میں رکھے، کیا معلوم کل کو ہم پر کیا بیتنے والی ہے؟ جب ابتدائی مدنی زندگی میں مہاجرین کا مسئلہ مسلمانوں کے سامنے آیا تو حضورؐ نے قرآنی تعلیم کے مطابق اس کا عملی حل "مواخات" کے ذریعے فرمایا۔ یعنی جو ایسے لوگ آئے جن کے پاس کچھ نہیں تھا انہیں ان کا بھائی بنا دیا جن کے پاس کچھ تھا۔ اس طرح یہ اس سب کچھ میں شریک ہو گئے جو مدینہ کے مسلمانوں کے پاس موجود تھا۔

ہاں! ابھی جنگ جاری ہے اور ہمارا خیال ہے کہ جس قوم سے ہمارا واسطہ پڑا ہے اس کی ہمسائیگی میں جنگ کا خطرہ ہمیشہ ہمارے سر پر منڈلاتا رہے گا، اس خطرہ کے مٹنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو (اس قوم کی خوش قسمتی سے) اس میں کوئی ایسا بلند نظر مصلح پیدا ہو جائے جو اسے اس نفسیاتی احساس کہتری (INFERIORITY COMPLEX) کی کشمکش سے نجات دلا کر جس میں یہ صدیوں سے بری طرح گرفتار چلی آ رہی ہے، انہیں قامتِ آدمیت (HUMAN STATURE) عطا کر دے۔ اور یا اس پر ہم ایک بھرپور وار کر کے، اس کی نفسیات اس طرح کھولیں کہ ان کی رگوں سے وہ سارا (فالتو) خون بہ جائے جو ان میں سرسام پیدا کر رہا ہے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہمیں اپنے آپ کو یہ دھوکا نہیں دینا چاہیئے کہ ہم حالتِ امن میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو مستقلاً جنگ کی حالت میں سمجھنا چاہیئے اور اسی نہج سے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ ویسے بھی، زندگی کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

اور مسلمان کی تو زندگی ہی، حضور نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق، یہ ہے کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اس کے اندر شامل ہو۔ اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ جہاد (تگ و تاز مسلسل) تو زندہ رہنے کی بنیادی شرط، اور دشمن کے ہر شر سے بچنے کی اولیں صفِ مدافعت ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ

جہاں باز و سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اس کے لئے ہمیں اپنی انفرادی زندگی میں کئی عادتوں کو بدلنا ہوگا، اور اجتماعی زندگی کے لئے اپنے نظام کو نئے قالب میں ڈھالنا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نیا قالب، قرآن کے علاوہ اور کہاں سے مل سکتا ہے (اس اجمال کی تفصیل طلوعِ اسلام کے صفحات میں، گذشتہ اٹھارہ برس سے آپ کے سامنے آ رہی ہے۔ اور بار بار آئے گی، کہ اس کے سوا ہمارے لئے حیاتِ تازہ کی کوئی صورت نہیں۔

اس وقت (جبکہ یہ سطور لکھی جارہی ہیں) ہماری حالت نیم درجاکی سی ہے۔ نہ تو بیچ بچ جنگ جاری ہے اور نہ ہی جنگ ختم ہوجانے کے بعد والی حالت۔ یہ حالت کب تک جاری رہے گی، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ رموز مملکت ہیں۔ جنہیں ارباب مملکت ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن موجودہ حالت کے طول پکڑ جانے سے ایک ایسی صورت پیدا ہورہی ہے جسے، ارباب بست وکشاد کے سامنے لانا نہایت ضروری ہے۔ ملک کی اکثریت ان افراد پر مشتمل ہے جن کا گزارہ روزمرہ کی مزدوری یا چھوٹے چھوٹے کاروبار پر چلتا ہے۔ ان کے پاس اتنا اندوختہ نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ عرصہ تک بغیر آمدنی کے گزارہ کرسکیں ــــ بعض حالتوں میں تو ان کے لئے دو چار دن کے لئے بغیر آمدنی کے گذارہ کرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کا شمار ان "مہاجرین" کے زمرہ میں بھی نہیں ہوتا جن کا ذکر ہم اوپر کرچکے ہیں۔ کاروباری تعطل کے لمبے عرصہ میں ان کی حالت بڑی ناگفتہ بہ ہوجاتی ہے۔ اور یہ بھی جنگ کے پیدا کردہ مسائل میں سے ایک مستقل مسئلہ (PROBLEM) بن جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امر کے فیصلہ پر کہ جنگ جلد چھیڑ دی جائے یا اسے مستقلاً ختم کردیا جائے اس مسئلہ کو اثر انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ فیصلہ مملکت کے بلند اور دور رس مطامح کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیئے۔ لیکن تعطل کے طول کھینچنے کی صورت میں، اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل ضرور سوچنا چاہیئے۔ اس حل میں، اس طبقہ کی ضروریات زندگی سے متعلق مشکلات کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔ اور وسائل نشرواشاعت (مثلاً ریڈیو وغیرہ) کو کام میں لاکر ان کی ذہنی تربیت کا بھی ایسا انتظام کرنا چاہیئے جس سے یہ قابل برداشت مشکلات کا مقابلہ سکون قلب اور جمعیت خاطر سے کرسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے وسائل نشرواشاعت کو لوگوں کی ذہنی تربیت کے لئے استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ان سے بڑا ہی مفید مطلب تعمیری کام لیا جاسکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان وسائل و ذرائع کو بیوروکریسی کے چنگل سے نکال کر ایسے ارباب فکر و نظر کے مشوروں کے تابع کردیا جائے جو ملت کی تعمیر جدید کا درد دل میں رکھتے ہوں۔ ان کے ذریعے عوام کو استدلاً اور الزاماً سمجھایا جائے کہ جن مقاصد اور اقدار کی خاطر جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے وہ ایسی بیش قیمت ہیں کہ انکی خاطر سخت سے سخت مصیبت اور بڑی سے بڑی قربانی بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ جنگ کے زمانے میں جس قدر مصائب اور مشکلات کا سامنا ہو انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیئے اور اس حقیقت کا یقین رکھنا چاہیئے کہ جس مقصد کی خاطر یہ تکالیف پیش آرہی ہیں وہ ہماری جان، مال، راحت، آرام ہر شے سے عزیز ہے۔ اور جب تک ہم اس مقصد کے حصول کے لئے جنگ میں کامیابی حاصل نہیں کرلیتے اس وقت تک ہمیں ان تمام مشکلات کا بطیب خاطر مقابلہ کرنا ہے۔ عوام سے یہ باتیں محض جذباتی اپیل سے نہ کہی جائیں بلکہ انہیں دلائل و براہین کی رو سے اس طرح سمجھایا جائے کہ ان کی اہمیت ان کے دل کی گہرائیوں میں

حاگزیں ہو جائے۔ ہمیں یہ کام وسائل نشر و اشاعت (اخبارات اور ریڈیو وغیرہ) سے لینا چاہیئے، اور اس کے ساتھ ہی ایسا اطمینان کرنا چاہیئے کہ عوام کو تکالیف کا سامنا کم از کم کرنا پڑے۔ نیز ایسا کبھی نہ ہو کہ یہ تکالیف معاشرہ کے کسی ایک طبقہ کو برداشت کرنی پڑیں اور دوسرا طبقہ حسب معمول راحت و آرام کی زندگی بسر کرتا رہے۔ جب جنگ ملک کا مشترکہ مقصد ہے تو اس کے حصول میں جو تکالیف درپیش ہوں اُن میں بھی سارے ملک کو برابر کا شریک ہونا چاہیئے۔ یہ احساس وہ ہے (یعنی یہ احساس کہ یہ تکالیف وہ ہیں جن میں سارا ملک برابر کا شریک ہے) جس کے بعد تکلیف، تکلیف رہتی ہی نہیں۔

سب سے آخر اور اہم یہ کہ جنگ کے سلسلے میں حکومت جو فیصلے کرے ان پر تنقید نہیں کرنی چاہیئے اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جہاں تک پاکستان کی حفاظت اور خیر خواہی کا تعلق ہے، ارباب حکومت ہم آپ سے (اس باب میں) پیچھے نہیں۔ لیکن جہاں تک ان معلومات کا تعلق ہے جن کی بنیادوں پر ایسے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں، ان میں سے بیشتر ایسی ہوتی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا اور نہ ہی ارباب حکومت انہیں عام کر سکتے ہیں۔ اس لئے وہ، ہمارے مقابلہ میں، صحیح فیصلہ کرنے کے لئے ہم سے بہتر پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اس امر پر یقین اور اطمینان رکھیں کہ وہ جو فیصلہ بھی کریں گے ملک و ملت کی بہتری ہی کے لئے کریں گے۔ اس سے قوم کی یک جہتی قائم رہے گی۔

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(اقبالؒ)

شہر کے لوگ

(بہ سلسلہ)

(پرویز صاحب کی تقریر جو انہوں نے ۲۰ اکتوبر کی شب ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی)

برادرانِ عزیز! سلامت و رحمت۔

جب سے سورج نے اپنی آنکھ کھولی ہے زمین پر سلسلۂ روز و شب جاری ہے۔ عام حالات میں رات اور دن کی اس گردشِ لامتناہی کی کیفیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

لیکن صبح و شام کے اس بے حرکت و بے رنگ سلسلہ میں بعض دن ایسے بھی آجاتے ہیں جنہیں خدا نے ایام اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کے اپنے دن۔ یہ خدا کے اپنے دن" وہ ہیں جن میں حق و باطل کا کوئی فیصلہ کن معرکہ رونما ہوا ہو۔ گذشتہ ستمبر کے سترہ دن ہمارے ہاں بھی ایسے آئے جنہیں بجا طور پر ایام اللہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں حق و باطل کا وہ قیامت خیز معرکہ سرزد ہوا جس نے پاکستان کی تاریخ ہی کے نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ کے صفحات پر اپنا نقش دوام اس طرح ثبت کر دیا ہے کہ گردشِ لیل و نہار کا کوئی حادثہ اسے محو نہیں کر سکتا۔ اس معرکہ میں ہم نے کیا کچھ حاصل کیا۔ اس کی تفاصیل کا بیشتر حصہ اس وقت تک آپ کے سامنے آچکا ہے اور باقی ماندہ آہستہ آہستہ سامنے آتا رہے گا۔ دشمن کے سینکڑوں میل پر مشتمل رقبہ ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم نے اس کے لاتعداد ٹینک تباہ کر دیئے اور متعدد صحیح و سالم ہماری گرفت میں ہیں۔ ہم نے اس کے سینکڑوں طیاروں کے پر نوچ ڈالے اور بیسیوں ہمارے ہاں پابندِ قفس ہیں۔ اس کے بے شمار قیدی محبوس ہوئے اور بے حد و نہایت اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ ہمیں بطور غنیمت ملا۔ یہ سب فتوحات بڑی قیمتی ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں لیکن ان سب سے زیادہ بیش قیمت متاع ایک اور ہے۔ جو ہمیں اس جنگ سے حاصل ہوئی، وہ متاعِ بے بہا یہ ہے کہ ہم نے خود اپنے آپ کو پا لیا۔ صدیوں سے ہماری قوم اپنی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اسے اپنے آپ کا علم ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم

ہی نہیں تھا کہ اُس کے اندر کس قدر ممکنات زندگی مضمر ہیں۔ اُسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ کیسی محیر العقول خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اُسے اِس کا مطلقاً اندازہ نہیں تھا۔ ہم پانچ ستمبر کی شام کو سوئے تو اِسی قوم کے افراد تھے۔ لیکن جب ۶ ستمبر کی صبح کو بیدار ہوئے تو وہ کوئی اور ہی قوم تھی۔ ریاض خیرآبادی نے کہا تھا کہ ؎

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی!

۶ ستمبر کی صبح دشمن کی توپوں کی گرج نے جو فضا کے پردے چاک کئے ہیں تو ہمارے سامنے ایک اور ہی دنیا تھی۔ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں میں ہمیں اپنے آپ کی تھوڑی سی جھلک دکھائی دی تھی لیکن اُس کے بعد ہم اپنی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گئے۔ نتیجہ اسکا یہ کہ دنیا کی کوئی خرابی ایسی نہیں تھی جو ہمیں اپنے اندر دکھائی نہ دیتی ہو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ ہم میں بعض خرابیاں فی الواقعہ موجود تھیں لیکن ایک مسلسل پراپیگنڈے نے ہمارے اندر ایسا احساسِ کہتری پیدا کر دیا کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم دنیا کی ناکارہ ترین قوم ہیں! ہم میں کوئی خوبی ہی نہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ ہمیں پاکستانی کہلاتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔

اِس احساسِ کہتری کو دور کرنے کے لئے قرآن کریم کی راہ نمائی ہمارے سامنے تھی۔ وہ ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا کہ۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹)۔ تم گھبراتے کیوں ہو۔ تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین محکم رکھ کر خود اعتمادی پیدا کر لو، تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ وہ ہم سے بار بار کہتا تھا کہ تم اپنی تعداد کی کمی سے مت گھبراؤ۔ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (۸/۶۵) اگر تم میں بیس ثابت قدم مجاہد ہوئے تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آجائیں گے، ہم ان آیات کو پڑھتے اور ان کی تلاوت کا ثواب حاصل کر کے قرآن کو پھر بالائے طاق رکھ دیتے۔ تاریخ میں ہمارے سامنے ہمارے اسلاف کے وہ محیر العقول کارنامے آتے جنہیں ہمارے لئے نمونہ بننا تھا۔ ہم ان کارناموں کو پڑھتے تو اپنی بے عملی اور دوں ہمتی کو اس خود فریبی کے پردے میں چھپا کر آگے بڑھ جاتے کہ یہ سب کچھ معجزات اور کرامات کی رُو سے ہوا تھا۔ اب وہ معجزے کس سے سرزد ہو سکتے ہیں؟

ہمارا حکیم الامت ہم سے بار بار کہتا کہ

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

لیکن ہم اسے ایک شاعر کا شاعرانہ خواب کہہ کر حوالۂ طاؤس و رباب کر دیتے۔ یہ کچھ ہوتا رہا، اور ہم بدستور سوئے رہے۔ لیکن ۶ ستمبر کی صبح توپوں کے ایک ہی دھماکے نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور قوم کے تحت الشعور میں خوابیدہ قوتیں اس طرح ابھر کر سامنے آگئیں جس طرح برلبط کے خاموش تاروں میں چھپے ہوئے نغمے، مضراب کی ایک ضرب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے ٹریا شکار طیاروں کے جانفروش شاہین بچوں کو دیکھا تو وہ اس حقیقت کی عملی تفسیر تھے کہ

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

ہم نے اپنی بری اور بحری فوجوں کے جانبازوں پر نگاہ ڈالی تو ان کا جوشِ عمل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

ہم نے اپنی قوم کی طرف دیکھا تو وہ ہمت، استقامت، عزم، ایثار، بلند حوصلگی، کشادہ نگہی، خود فراموشی اور ایثار پرستی کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ قوم کیا تھی۔ ایک ٹیم تھی، جس کے ہر کھلاڑی کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ یعنی اپنی ٹیم کی کامیابی اور فریقِ مقابل کی شکست۔ آسمان کی آنکھ اس قوم کو دیکھ کر ششدر و حیران تھی اور اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی قوم ہے جسے اس نے گذشتہ شب کی تاریکی میں لپیٹ کر سلایا تھا!

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ متاعِ بے بہا جو ہمیں اس معرکۂ حق و باطل سے حاصل ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو پالیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱/۲۱) تم معجزات اور کرامات کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو۔ تم خود اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ اس میں تمہیں ایسی ایسی محیر العقول قوتیں نظر آئیں گی جن کا تم قیاس و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو فی الواقعہ وہاں ان قوتوں کا بے بہا ذخیرہ تھا۔ ان سے ہمیں اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ ہمارے اسلاف سے جو معجزانہ کارنامے

سرزد ہوئے تھے وہ ان کے ذوقِ یقین اور جوششِ کردار کے مظاہرے تھے۔ وہی معجزے ہم سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقین محکم حاصل ہو۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے جذبۂ عمل بیدار، اس سے وہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی ہے جسے علامہ اقبال نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

سوال یہ ہے کہ ان بے پناہ قوتوں کو جو ہم میں ہنگامی طور پر بیدار ہوئی ہیں مستقل متاعِ حیات کیسے بنایا جائے۔ ہمارے مستقبل کا دار و مدار اسی سوال کے اطمینان بخش جواب پر ہے اور یہ جواب قرآن کے علاوہ اور کہاں سے مل سکتا ہے؟ والسلام!

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان)

تمام بزمہائے طلوعِ اسلام اور اس کی دعوتِ قرآنی سے متفق احباب

قومی دفاعی فنڈ میں

بڑھ چڑھ کر حصہ لیں ــــ اور اس سلسلے میں اپنی سرگرمیوں سے ادارہ طلوعِ اسلام کو باقاعدگی سے مطلع کرتے رہیں۔

(ادارہ طلوعِ اسلام)

مفت:- مجرب دوا برائے دمہ، دردِ گردہ، پتھری
پتہ:- حاجی محمد دین شیخ آئس فیکٹری متصل گنیش کھوپرا ملز لارنس روڈ کراچی
نوٹ:- جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

اِن کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے

کہتے ہیں کہ روما کے ایک گرجے میں حضرت عیسٰےؑ کی ایک نادر تصویر تھی جس سے دیکھنے والوں کے دل میں عجیب و غریب تاثرات پیدا ہوتے تھے۔ حضرت عیسٰےؑ کے پرستار آتے اور اپنی عقیدت کی شمعیں تصویر کے نیچے روشن کرتے۔ ان شمعوں کا دھواں اس تصویر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ رفتہ رفتہ، اس دھوئیں کی سیاہی نے پوری کی پوری تصویر کو ڈھانپ دیا۔ اب عقیدت کی شمعیں تو جلتی ہیں لیکن تصویر کا صرف چوکھٹا دکھائی دیتا ہے۔ اصل تصویر پر دھوئیں کی سیاہ چادر بچھ چکی ہے۔ اور یہ چادر دن بدن دبیز ہوتی چلی جا رہی ہے۔

حضرت عیسٰےؑ کی اس تصویر کی داستان حقیقی ہو یا تمثیلی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے عظیم انسانوں کے درخشندہ کارنامے جنہوں نے آنے والوں کے لئے نمونہ اور مثال بننا ہوتا ہے، ان کے عقیدتمندوں کی افسانہ طرازیوں کے نیچے اس طرح دب جاتے ہیں کہ اس کے بعد افسانے باقی رہ جاتے ہیں اور حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ ہماری تاریخ میں، نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کا دور، صداقت۔ شجاعت۔ عدالت۔ جوشش کردار۔ اور حسنِ عمل کے محیر العقول کارناموں کی درخشندہ مثالوں کا دور تھا۔ یہ وہ کارنامے تھے جنہیں آنے والوں کے لئے 'زندگی کے مہیب خطرات اور جانگسل مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے' بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) بننا تھا۔ ان کارناموں کی ایک ایک مثال ایسی تھی جسے حوادثِ زمانہ کی تلاطم خیزیوں میں روشنی کے مینار کا کام دینا تھا۔ جسے نازک سے نازک وقت میں، گرتے ہوئے حوصلوں کو سنبھالنا اور ڈوبتی ہوئی ہمتوں کو ابھارنا تھا۔ ان کارناموں نے، خطرات میں گھرے ہوئے انسان کو یہ بتانا تھا کہ جب 'ایک انسان'، اس سے بھی زیادہ پُرخطر اور نازک حالات میں، ایسے حیرت انگیز کام کر سکتا ہے' تو میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ جب انہوں نے ایسے وقت میں یہ کچھ

کر دکھایا تھا، تو مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ جب وہ یہ کچھ کر سکتے تھے، تو میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ اس طرح ماضی کی اُن داستانوں نے آنے والوں کے لئے حال کی تابندگی اور مستقبل کی درخشندگی کا موجب بننا تھا۔

لیکن اُس درخشندہ و تابناک دور کی تاریخ کے ساتھ بھی ہماری عقید تمندیوں نے وہی کچھ کیا جو حضرت عیسیٰؑ کی تصویر کے ساتھ ہوا تھا۔ اُس عہد کے ان کارناموں کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ انسانوں کے کارنامے نظر ہی نہیں آتے بلکہ مافوق البشر (بلکہ مافوق الفطرت) قوتوں کے مظاہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کارناموں کے متعلق قدم قدم پر یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ حق پرست انسانوں کے دست و بازو کے معرکے نہیں تھے، براہ راست خدا کی تائید غیبی کے مظاہرے تھے۔ میدانِ کارزار میں ان کی حیرت انگیز کامرانیاں اور فتحمندیاں، ان کے یقینِ محکم، عزمِ راسخ اور جوشِ کردار کا نتیجہ نہیں تھیں، وہ آسمان سے نازل ہونے والے فرشتوں کے کارنامے تھے۔ جو مثالی کارنامے خود نبی اکرمؐ کے ہاتھوں سرزد ہوئے تھے، وہ معجزات تھے جو نبی کے سوا اور کسی سے سرزد نہیں ہو سکتے۔

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہی کارنامے، جنہیں اسلام کی تاریخ ہی میں نہیں، نوعِ انسانی کی تاریخ میں، انسانی ملکات کی درخشندہ تصویر بننا تھا، ہماری عقید تمندی میں اضافہ کا موجب تو بنتے ہیں، قابلِ تقلید مثال نہیں بن سکتے۔ چنانچہ جب ان کارناموں کا تذکرہ ہمارے سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے ہمارا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ خدا نے حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرنا تھا۔ اسلام کا بول بالا کرنا اور کفار کو نیچا دکھانا، اس کا طے شدہ پروگرام تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب یہ خدا کا طے شدہ پروگرام تھا تو ایسا ہو کر رہنا تھا۔ کفارِ عرب تو ایک طرف ساری دنیا بھی مقابلہ کے لئے آجاتی تو خدائی پروگرام کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھوں (بظاہر) یہ کارنامے سرزد ہوئے وہ محض خدائی فیصلہ کے سامنے لانے کے لئے آلۂ کار تھے۔ اس میں ان کی کسی حسن کارکردگی کا دخل نہیں تھا۔

اور جب رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے معرکہ آرا کارنامے سامنے آتے ہیں، تو ہمارے دل میں فوراً یہ خیال ابھر آتا ہے کہ ہاں صاحب! وہ خدا کے رسول تھے۔ اب ان جیسے کام کون کر سکتا ہے؟ کس بشر کی مجال ہے کہ ان کارناموں کی گرد تک پہنچنے کا خیال تک بھی دل میں لائے۔ ایسا تصور کرنا کہ کوئی انسان اس قسم کے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے، شانِ رسالت میں انتہائی گستاخی اور سوءِ ادبی ہے۔

اور جب صحابہ کبارؓ کی محیر العقول معرکہ آرائیاں۔ ان کی عدیم النظیر قربانیاں، ہجوم مصائب میں ان کی کوہ آسا استقامت۔ انبوہ مشکلات میں ان کی جنت بداماں جمعیتِ خاطر، میدانِ کارزار میں ان کی بے پناہ ہمت اور شجاعت۔ نازک سے نازک وقت میں ان کی صداقت۔ غالب آجانے کی صورت میں ان کی عدالت۔ غرضیکہ مستقل اقتدارِ انسانیت پر ان کا یقینِ محکم اور ان کے تحفظ کے لئے ان کا عملِ پیہم۔ جب ان کے تذکرے ہمارے سامنے

آتے ہیں، تو ہم بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ ان کے کیا کہنے ہیں۔ وہ رسول اللہؐ کے صحابی تھے۔ ہم گنہگار ان کی ریس کیسے کر سکتے ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ ایسی نادر اور درخشندہ تصویر، کس طرح ہماری عقیدتمندیوں کی شمعوں کے دھوئیں سے چیکٹ ہو کر رہ گئی؟ ایسی چیکٹ کہ اگر اب کوئی، اسے کھرچ کر اصل تصویر سامنے لانے کی کوشش کرے تو پجاری اسے ملحد و بے دین قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کر دیں۔ اس لئے کہ پجاریوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل تصویر لوگوں کے سامنے نہ آنے پائے۔ اگر وہ تصویر بے نقاب ہو کر سامنے آجائے تو لوگ، ان پجاریوں کی شباہت کو تصویر کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے اور جب ان دونوں میں کوئی مماثلت نظر نہیں آئے گی تو ان پجاریوں کا پرستار کوئی نہیں رہے گا۔

حق و صداقت کا مقصد لے کر اٹھنے والوں کے ساتھ خدا کی تائید و نصرت برحق ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ تائید و نصرتِ خداوندی ہے کیا اور یہ حاصل کیسے ہوتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے خارجی کائنات اور انسانی دنیا کے لئے کچھ قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ جو شخص ان قوانین کے مطابق چلتا ہے اس کی کوششیں بار آور ہو جاتی ہیں، جس کی محنت ان قوانین سے ہم آہنگ ہوتی ہے اس کے نتائج عام اندازوں سے کہیں زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ (مثلاً) اگر ایک شخص اپنی کشتی پانی کے بہاؤ کی طرف چلاتا ہے تو کشتی کی رفتار بہت تیز ہو گی۔ اگر وہ اپنی ناؤ ندی کے چڑھاؤ کی طرف لے جاتا ہے تو اسے مشقت بھی سخت اٹھانی پڑے گی اور کشتی کی رفتار بھی بہت کم رہے گی۔

خارجی کائنات کے قوانین کی طرح، انسان کی تمدنی زندگی سے متعلق بھی خدا کے قوانین متعین ہیں (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ اگر کوئی فرد یا قوم ان قوانین کے مطابق کام کرے گی تو اس کے نتائج خوشگوار ہوں گے۔ جو قوم ان کے خلاف چلے گی، وہ کامیاب نہیں ہو گی۔ (مثلاً) اس کا قانون یہ ہے کہ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۲۱) ظلم و زیادتی کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی جماعت، مظلوم کی حمایت میں، ظالم کے مقابلہ کے لئے اٹھتی ہے، تو (مادی اسباب و ذرائع کے برابر ہونے کی صورت میں بھی) ان کی کوششوں کے نتیجہ میں وہی فرق ہو گا جو کشتی کو بہاؤ کی طرف چلانے والے اور چڑھاؤ کی طرف کھینچنے والے کے نتیجہ میں فرق ہوتا ہے۔ جو مقصد، حق و صداقت پر مبنی ہو، اس کی محکمیت پر یقین (جسے ایمان کہتے ہیں)، انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے، اور زاویۂ نگاہ کے بدل دینے سے انسان کے اندر جو نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس سے وہ (گویا) ایک دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ اس ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت اس اصول (یا مشقِ قدم)

اور طبیعی زندگی کے کسی مفاد میں ٹکراؤ ہو جائے (اُن میں T iE پڑ جائے)، تو یہ شخص (یا قوم) مستقل قدر کی حفاظت کے لئے اُس طبعی مفاد کو بلا تامل قربان کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر اس کے لئے اسے جان تک بھی دینی پڑے، تو اس میں بھی اسے ذرا تردد نہیں ہوتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو شخص کسی مقصد کی حفاظت کے لئے بطیب خاطر، دیکھ بھال اور سمجھ سوچ کر، جان تک دینے کے لئے تیار ہو، اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں خوابیدہ ہوتی ہیں جن کا اسے عام حالات میں خود بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ جب وہ کسی متاعِ عزیز کے تحفظ کی خاطر، خطرات کا سامنا کرتا ہے اور یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے، تو اس کی خوابیدہ قوتیں یک لخت بیدار ہو جاتی ہیں اور اس سے ایسے محیر العقول کارنامے سرزد ہو جاتے ہیں، جن پر اور تو اور، وہ خود حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ اسے کہتے ہیں تائید غیبی۔ اسے کہتے ہیں خدا کی نصرت۔ اسے کہتے ہیں فرشتوں کی امداد۔

اس سے واضح ہے کہ یہ تائید غیبی، یہ خدا کی نصرت، حاصل اُسے ہوتی ہے جو خود اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ تائید و نصرت، اس تبدیلی کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی کا نام ہے خدا کی معیت (خدا کا کسی کے ساتھ ہونا)۔ یعنی، جو شخص اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے، خدا اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا یونہی بیٹھے بٹھائے کسی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اور جس کے ساتھ خدا ہو جاتا ہے اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ مثلاً، قرآن کریم میں ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۸/۴۶)۔ "خدا صابرین کے ساتھ ہوتا ہے"۔ یعنی جو لوگ، حق و صداقت پر مبنی مقصد کی خاطر، خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور اس میں پوری پوری استقامت سے کام لیتے ہیں۔ کسی مقام پر ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ خدا ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جس مقام پر یہ اصول بیان ہوا ہے، وہ آیات یوں ہیں:

> اے جماعتِ مومنین! جب تمہیں دشمن کے لشکر کا مقابلہ کرنا پڑے تو جم کر کھڑے ہو جاؤ اور قوانین خداوندی کو بڑی شدت کے ساتھ اپنے سامنے رکھو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔
>
> اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ آپس میں مت جھگڑو۔ ایسا کرو گے تو تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس لئے تم ثابت قدمی سے کام لو۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ (۸/۴۵-۴۶)

یہی وہ ثابت قدم ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ "اگر یہ دو سو ہوں گے تو دو ہزار پر غالب آئیں گے" اور اگر سامانِ حرب وضرب کی کمی ہوگی تو بھی "یہ اپنے سے دگنوں پر تو ضرور غالب آجائیں گے" (۸/۶۵ — ۶۶)۔

اب رہی "فرشتوں کی مدد" تو اسے بھی استقامت سے مشروط قرار دیا۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے۔

جو لوگ اس حقیقت پر یقین محکم رکھتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو (تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ) ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ جو ان سے کہتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ بالکل نہ گھبراؤ..... ہم دنیا اور آخرت دونوں میں، تمہارے رفیق ہیں۔

(۴۱/۳۰)

اس "نزولِ ملائکہ" سے کیا ہوتا ہے؟ دلوں کو سکون وطمانیت حاصل ہو جاتی ہے۔ انسان کو جمعیتِ خاطر نصیب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بدر کے میدان میں جن فرشتوں کے نزول کا ذکر آیا ہے ان کے متعلق کہا ہے کہ لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ (۸/۱۰) "تاکہ اس سے تمہارے دلوں کو طمانیت نصیب ہو جائے"۔ اس کے ساتھ پھر یہ واضح کر دیا کہ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ (۳/۱۲۴)۔ دشمن خواہ کتنے ہی جوش وخروش سے تم پر حملہ کرے۔ اگر تم ثابت قدم رہے اور اپنے فرض منصبی (ڈیوٹی) کو نہ بھولے۔ تو پھر "ملائکہ کا نزول" ہوگا — اسی کو خدا کی نصرت سے تعبیر کیا گیا ہے وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ (۳/۱۲۳)۔

ان مقامات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ خدا کی تائید ونصرت سے مفہوم کیا ہے اور یہ کن لوگوں کو، کن شرائط کے پورا کرنے کے بعد ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک ایسا اصول بیان کر دیا ہے جس کے بعد اس باب میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ سورۂ محمد میں، جنگ کے سلسلہ میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ (۴۷/۷)

اے ایمان والو! اگر تم نے خدا کی مدد کی تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ یعنی تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا۔

"اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا" یہ "خدا کی مدد کرنا" اس کے سوا کیا ہے کہ تم حق وصداقت کا مقصد (CAUSE) لے کر اٹھو اور خدا کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق اقدامات کرو۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خطرات کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو گے۔ اور اس ثابت قدمی کا نتیجہ فتح وکامرانی ہوگا۔

یہ ہے خدا کی تائید ونصرت کا مفہوم۔ یعنی اس میں پہل یا سبقت (INITIATIVE) انسان کی طرف

سے ہوتی ہے۔ اور جب انسان اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کر لیتا ہے تو اس کے بعد تائید و نصرت خداوندی کا حاصل ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس باب میں خدا خود یہ کہتا ہے کہ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰/۴۷) اس قسم کا یقین محکم رکھنے والوں کی نصرت، ہم پر فرض ہو جاتی ہے۔ جو قوم اس قسم کی تبدیلی اپنے اندر پیدا نہیں کرتی، اس کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اسے خدا کی تائید نصیب نہیں ہوتی اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ اس کا واضح فیصلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس قسم کے صاحبانِ عزیمت و استقامت، حضرات کا جم کر مقابلہ کرتے ہیں تو اس کا سارا (CREDIT) انہی کو ملتا ہے۔ ان پر خدا کی طرف سے تحسین و تبریک کے پھول نچھاور ہوتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (۲/۱۵۷)۔ خدا ان پر سلام و صلوٰۃ کے ڈونگرے برساتا ہے۔ خدا نے یہ نہیں کہا کہ اس میں ان لوگوں کی کیا کاریگری تھی۔ یہ تو سب کچھ ہماری تائید سے ہوا۔ نہ ہی یہ کہا کہ یہ کارنامے ہمارے فرشتوں کے ہیں۔ فرشتے تو خود، خدا کے ساتھ ان اربابِ عزم و ہمت کی حمد و ستائش میں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ سورۂ احزاب میں ہے هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (۳۳/۴۳)۔ خدا اور اس کے فرشتے تم پر درود و سلام بھیجتے ہیں — یاد رکھئے! انسانوں کی دنیا میں خدا کے کام، انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ اگر ایک قوم، ان امور کی سرانجامدہی کے لئے نہیں اٹھتی، تو وہ یہ نہیں کہتا کہ تم نہیں اٹھتے ہو تو نہ اٹھو۔ ہم یہ کام تمہاری مدد کے بغیر خود کر لیں گے، یا اپنے فرشتوں کے ذریعے کرا لیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس کے لئے تیار نہیں ہوتے تو ہم تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئیں گے — وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ وہ ان امور کی سرانجامدہی کے لئے پوری جدوجہد کرے گی وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (۵/۵۴)۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرے گی۔

رسول اللہؐ کے متعلق قرآن کریم میں ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸/۱۱۰) ان سے کہدو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اس فرق کے ساتھ کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔" وحی موہبتِ خداوندی ہے جس میں نبی کے اپنے اختیار و ارادہ، یا خیالات و خواہشات کا دخل نہیں ہوتا۔ اسے یہ علم خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے، جسے وہ عام انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ خصوصیت نبی کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی۔

رسول کا فریضہ وحیٔ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس پر خود عمل کرتا ہے اور ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں وحی کی تعلیم ایک عملی نظام بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کے لئے اسے سخت ترین

مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بیسیوں لڑائیاں لڑنی پڑتی ہیں۔ پھر جب یہ نظام متشکل ہو جاتا ہے، تو اُسے وہ تمام امور سرانجام دینے ہوتے ہیں جو ایک مملکت کے سربراہ کے فرائض کہلاتے ہیں۔ وہ یہ تمام امور ایک انسان کی حیثیت سے سرانجام دیتا ہے اور اس میں اپنے حسنِ تدبر اور سیرت و کردار کا ایسا مثالی نمونہ پیش کرتا ہے جسے شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کہا جائے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، رسول یہ سب کچھ ایک انسان کی حیثیت سے کرتا ہے اور اس میں کوئی فوق الفطرت عنصر (SUPERNATURAL ELEMENT) شامل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی دوسرے انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار پاتی ہے۔ اگر رسول یہ کچھ ایسی مافوق الفطرت قوتوں کی رو سے کرے جو دوسرے انسانوں کو میسر نہیں آسکتیں تو دوسرے انسانوں کے لئے اس کی زندگی نمونہ کس طرح بن سکتی ہے؟ رسول کو جو تائیدِ خداوندی حاصل ہوتی ہے وہ وہی ہوتی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ یعنی وہ قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت کرتا ہے اور اس کے خوشگوار نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ اگر (بفرضِ محال) وہ کسی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرے تو اسے بھی اس سے ویسا ہی نقصان ہو جیسا دوسرے انسانوں کو۔ چنانچہ اس ضمن میں خود نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے کہلوا دیا گیا کہ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)۔ "ان سے کہدو کہ اگر میں خدا کی نافرمانی کروں، تو میں ڈرتا ہوں کہ خدا کا تباہ کن عذاب مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیگا"۔

لہٰذا، جو کچھ نبی اکرمؐ نے "بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کی حیثیت سے کر کے دکھایا تھا، وہ دوسرے انسانوں کے لئے ماڈل تھا۔ یہ ہے وہ ماڈل جو زندگی کی مکمل ترین نمائندگی کرتا، اور مقامِ انسانیت کی حسین ترین تفسیر سامنے لاتا ہے۔ وہ ملکھے پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والے سے پکار کر کہتا ہے کہ تم ہمت کیوں ہارتے ہو۔ افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اٹھو۔ قدم بڑھاؤ اور دیکھو کہ تم بھی کس طرح یہی کچھ کر سکتے ہو!

لیکن معاشرہ کا قیام اور مملکت کی تشکیل، ایک فرد کا کام نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحابہ کبارؓ اسی جماعت کے افراد تھے۔ انہی کے متعلق کہا گیا تھا کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ (۸/۶۲)۔ "اے رسول! خدا نے تمہیں اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین سے تقویت عطا کی"۔ یہ جماعت بھی انسانوں ہی پر مشتمل تھی اور ان کی خصوصیت یہی تھی کہ وہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے تھے۔ انہیں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں انہی قوانین کے اتباع سے ہوئیں۔ اور جہاں ذرا سی لغزش ہوئی۔ انہیں بھی اسی طرح شکست ہو گئی جس طرح دوسرے انسانوں کو ہوتی ہے۔ چنانچہ ان شکستوں کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

أَوَلَمَّآ أَصَٰبَتۡكُم مُّصِيبَةٌ قَدۡ أَصَبۡتُم مِّثۡلَيۡهَا قُلۡتُمۡ أَنَّىٰ هَٰذَاۖ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِندِ أَنفُسِكُمۡ...... (۳/۱۶۴)۔

جب تمہیں شکست کا نقصان اٹھانا پڑا — حالانکہ اس سے پہلے تم دشمن کو اس سے دگنا نقصان پہنچا چکے تھے ۔ تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ شکست کیوں ہوئی ؟ ان سے کہدو کہ یہ تمہاری اپنی غلطی کی وجہ سے ہوئی ۔

دوسری جگہ ہے ۔

إِن يَمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ ٱلۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهُۥۚ وَتِلۡكَ ٱلۡأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ ٱلنَّاسِ (۳/۱۳۹)

اگر جنگ میں تمہیں شکست کا زخم لگا ہے تو (اس سے پست ہمت ہونے کی کوئی بات نہیں) ۔ اس سے پہلے تمہارے دشمن کو بھی اسی قسم کا زخم لگ چکا ہے ۔ یہ میدان جنگ ہے ۔ اس میں اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے ۔

لہذا ، جو کچھ صحابہ کبارؓ نے کر کے دکھایا ، وہ ان کے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا نتیجہ تھا ۔ اس میں کوئی فوق الفطرت عنصر کارفرما نہیں تھا ۔ انہوں نے انسانوں کی حیثیت سے سب کچھ کیا ۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا وہ ہر انسان کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسی طرح قوانین خداوندی کا اتباع کرے ۔ جنگ اُحد میں ، نبی اکرمؐ سپہ سالار تھے اور صحابہؓ کی جماعت ، فوج ۔ اس کے باوجود ، جب لشکر کے ایک دستہ سے ذرا سی غلطی ہوئی تو میدان کا رُخ بدل گیا اور فتح شکست میں تبدیل ہو گئی ۔ مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ بھی زخمی ہو گئے ۔ اس کے بعد جب اس غلطی کو درست کر لیا تو اس نقصان کی تلافی ہو گئی ۔ اسی طرح جنگ حنین میں جب مسلمانوں کا لشکر اپنی کثرت تعداد پر اتر گیا اور ان بنیادی خصوصیات سے ذرا غافل ہو گیا جن کی وجہ سے کامیابی ہوتی ہے تو اسے شکست ہو گئی ۔ لیکن جب وہ پھر انہی خصوصیات کی طرف آ گئے تو یہی شکست فتح میں تبدیل ہو گئی ۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ انسانوں کی دنیا میں کوئی مافوق الفطرت قوت کام نہیں کرتی ۔ مافوق الفطرت قوت کا تصور یوں پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ باہمت انسان کر گزرتے ہیں ، بے ہمت انسان اسے اپنے بس کی بات نہیں سمجھتا اس لئے وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتا ہے کہ اس (باہمت) انسان کو کوئی فوق الفطرت قوت حاصل تھی جس کی وجہ سے اس نے ایسا محیر العقول کارنامہ کر دکھایا ۔ اس جھوٹی تسلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی کوشش ہی نہیں کرتا کہ خود بھی باہمت بن کر ویسے جیسے کارنامے کر دکھائے ۔ اور جب کوئی قوم بے ہمت ہو جائے تو وہ اپنے ماضی کے تابندہ کارناموں کے متعلق بھی یہی ذہنیت پیدا کر لیتی ہے کہ ان لوگوں کو خدا کی طرف سے

فوق الفطرت قوتیں حاصل تھیں جس کی وجہ سے وہ ایسا کر گزرے۔ ہمیں نہ وہ قوتیں حاصل ہیں۔ نہ ہی ہم وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کی وہی داستانیں جنہیں قوم کے لئے مضرابِ عمل بننا تھا، نیند آور لوریاں بن جاتی ہیں۔

ہم انہی خواب آور لوریوں میں مست تھے کہ ہندو پاکستان کی حالیہ (ستمبر ۱۹۶۵ء کی) جنگ میں، ہمارے جیوش وعساکر نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ہمارے اسلاف نے جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے تھے وہ ان کے مقصد کی صداقت۔ ان کے یقینِ محکم۔ عزمِ راسخ اور ہمت بلند کا نتیجہ تھا۔ اس میں کوئی فوق الفطرت عنصر کارفرما نہیں تھا۔ اس لئے جو لوگ بھی اسی انداز کے یقینِ محکم، عزمِ راسخ اور ہمت بلند سے کام لیں گے ان سے اسی قسم کے حیرت انگیز کارنامے سرزد ہو جائیں گے۔ چونکہ ان سپاہیوں کے ساتھ ہماری "روحانی عقیدتمندیاں" وابستہ نہیں ——— ہم اٹھارہ برس سے دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ وہ ہمارے ہی جیسے انسان ہیں ——— اس لئے ان کی حق پرستی، فرائض شناسی، جاں سپاری، خود سپردگی، ہمت، شجاعت، بسالت، استقامت، کے کارنامے ہمارے لئے مثال بن سکتے ہیں ——— اور یہ اس جنگ کا بڑا ہی خوشگوار پہلو ہے۔ اس نے ہماری غلط نگہی کو دور کر کے حقائق بینی سکھا دی ہے۔ اس نے ہماری تاریخ میں ایک نئے درخشندہ باب کا اضافہ کیا ہے۔

لیکن ہم بڑے افسوس سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کے ان کارناموں کو بھی فوق الفطرت توہم پرستیوں کی چادروں میں لپیٹا جا رہا ہے۔ کہیں یہ مشہور کیا جا رہا ہے کہ ایک ہندو پائیلٹ نے (جو ہمارا قیدی ہے) ——— بتایا کہ جب ہم، پاکستان کی فوجوں پر اوپر سے گولے پھینکتے تھے تو ہم دیکھتے تھے کہ نیچے ایک سفید ریش سبز پوش بزرگ کھڑے ہیں اور وہ ہمارے گولوں کو، کرکٹ کی گیند کی طرح، ہاتھوں میں دبوچ کر دوسری طرف پھینک دیتے ہیں۔ کہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ جب سکھ سپاہی قید ہو کر آئے تو انہوں نے پاکستانی فوج کو بڑی حیرت سے دیکھا اور کہا کہ وہ فوج کہاں ہے جو ہمارے سامنے میدانِ جنگ میں لڑتی تھی؟ جب ان سے کہا گیا کہ وہ فوج یہی ہے تو انہوں نے سر ہلا کر کہا کہ نہیں صاحب! وہ تو سفید نورانی لباس میں ملبوس، گھوڑ سواروں کی فوج تھی جن کے جسم پر کوئی گولی اثر نہیں کرتی تھی۔ ہم نے تو انہی کے خوف سے ہتھیار رکھ دیئے تھے۔ تم تو وہ نہیں ہو! یہ اور اسی قسم کے اور افسانے، دن رات وضع کئے اور ملک میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ اور سادہ لوح عوام خوش ہیں کہ ہماری کس طرح "غیب سے امداد" ہوئی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جیوش وعساکر کا ذوقِ یقین اور عملِ آہن گداز، ہمارے جانباز فضائیہ کی بے پناہ جرأتیں۔ لاہور اور سیالکوٹ کے قابلِ فخر پاسبانوں کی بے مثال قربانیاں۔ چودہ، چودہ دن تک، خندقوں میں

بیٹھ کر، چنے کی ایک مٹھی پر گزارہ کر کے، آگ اور خون کے سیلاب بلا انگیز کو روکنے والے مردانِ کارزار کی تحیر انگیز استقامت۔ ان کے یہ تمام درخشندہ کارنامے جن پر خود تاریخ فخر کرے گی، کس طرح تصوراتی سبز پوشوں اور توہماتی گھوڑ سواروں کی گرد میں گم ہوتے چلے جا رہے ہیں ـــــ اور یہ کچھ ابھی سے شروع ہو گیا ہے جب جنگ ہنوز ختم بھی نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان پر جو کچھ گزرے گی ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حالانکہ یہ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جب واہگہ کی سرحد پر دشمن نے اچانک یلغار کر دی تھی اور ہنوز ہماری فوجیں وہاں نہیں پہنچی تھیں تو انہوں نے ان تمام گاؤں کو تباہ و برباد کر دیا۔ وہاں کی بیشتر آبادی کو تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ ہماری عزت و ناموس کو مرکوں میں بھر کر لے گئے۔ اس وقت ان مظلوموں کی غیبی امداد نہ ہوئی۔ کسی سبز پیرہن یا سفید پوش نے انہیں دشمن کی دستبرد سے نہ بچایا۔ لیکن جب ہماری فوج وہاں جا پہنچی تو سترہ دن تک دشمن نے ہر ممکن کوشش کر دیکھی اور وہ ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے اور یوں اہل لاہور کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو محفوظ رہی۔ یہ سب کچھ ان جاں فروشوں کے عزم و ہمت کے تصدق ہوا۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے لیکن اس کے باوجود وہ افسانے ہیں کہ پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

بظاہر نظر آتا ہے کہ توہم پرستیوں کے یہ تانے بانے عوام (جہلا) کی عقیدتمندیوں کے بُنے ہوئے ہیں۔ لیکن ذرا سا غور کرنے سے، اس کے پیچھے حقیقت کچھ اور نظر آئے گی۔ ہمارے ارباب محراب و منبر اور اصحاب سجادہ و مصلّے نے اپنے لئے معاشرہ میں جو مقام از خود پیدا کر رکھا ہے، زمانۂ امن میں اس کا کوئی حریف نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سوا، ہر ایک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور حقارت کی نظروں سے ٹھکراتے رہتے ہیں۔ اور کوئی شخص ان کے خلاف ایک لفظ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں، تعظیم و تکریم کے تمام نذرانے ان کی طرف سے منہ موڑ کر مردانِ کارزار کی بارگاہ میں پہنچنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لوگ "ملا کی اذاں" اور "مجاہد کی اذاں" میں فرق، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ "مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست" اور "مذہب ملا و جمادات و نباتات" صاف الگ الگ دکھائی دینے لگ جاتے ہیں۔ اور ہر گوشے سے ان کی تعریف و توصیف کے غلغلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ یہ حضرات (ارباب منبر و مصلیٰ) اس کے خوگر ہی نہیں ہوتے کہ اپنے حلقہ سے باہر کسی اور کی عزت و توقیر برداشت کر سکیں ـــــ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ حضرات، صحابہؓ تک کو مجاہدین کے کارنامے بیان کرتے ہیں، کہ یہ ان کا شمار اپنے ہی حلقہ میں کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد، اس ہزار بارہ سو سال میں، کسی مردِ تیغ آزما کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا۔ ان کی تعریف و ستائش کے تمام زمزمے علم و زہد کے طبقہ تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا، جب جنگ کے زمانے میں، ارباب تیغ و سناں کی توصیف و تعریف کے چرچے عام ہوتے ہیں ـــــ اور ارباب تیغ و سناں بھی وہ (فوجی) جن میں یہ مسلسل اٹھارہ برس تک کیڑے ڈالتے چلے آ رہے تھے ـــــ تو یہ نگاہوں کا رُخ

دوسری طرف پھیرنے کے لئے ایک بڑا لطیف حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ان کے محیر العقول کارناموں کو "روحانی قوتوں" کی طرف منتقل کر دیا جائے تاکہ ان کا کوئی (CREDIT) ان جانبازوں کے حصے میں نہ آئے۔ تعریف و توصیف ہو تو آسمان سے اترنے والے، سبز پوشوں اور سبز عمامہ والوں کی، کیونکہ یہ کارنامے درحقیقت انہوں نے سرانجام دیئے تھے۔ ارباب تیغ و علم تو محض ان کے آلہ کار تھے۔ یعنی جس طرح کوئی شخص اس توپ کی تعریف نہیں کرتا جس کے گولوں نے دشمن کو تباہ کیا ہو، بلکہ توپچی کی تعریف کرتا ہے، اسی طرح، اصل تعریف کے مستحق یہ "آسمانی عناصر" قرار پا جاتے ہیں اور خاک، خون میں غلطیدہ، سپاہی، اُن کے آلہ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان خیالات کو اس شد و مد سے پھیلایا جا رہا ہے کہ (اور تو اور) خود ہمارے یہ قابل فخر سپاہی بھی۔ جن کی قوت ایمان اور جوش کردار نے یہ محیر العقول کارنامے کر کے دکھائے ہیں ــــ یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ صاحب! ہمیں خود معلوم نہیں کہ یہ کچھ کیسے ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ایسا کہنے میں اُس کسر نفسی اور منکسر المزاجی کا بھی دخل ہے جو ایک بلند نگاہ، کشادہ ظرف، صاحب عزم و ہمت فاتح کا فطری شعار ہوتا ہے، لیکن ڈر یہ ہے کہ اگر یہ عقیدہ بن گیا کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں ان جواں ہمتوں کے دست و بازو کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ سب کارنامے مافوق الفطرت عناصر کے رہین منت ہیں۔ تو یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔ جنگ میں، مال غنیمت و کشور کشائی، اتنی گراں بہا متاع نہیں ہوتی، جتنی بیش قیمت متاع خود آفرینی کی وہ دولت ہوتی ہے جو اس قوم کو میسر آجاتی ہے ــــ یعنی وہ قوم اپنے آپ کو منکشف (DISCOVER) کر لیتی ہے۔ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کو پہچان لیتی ہے۔ وہ جان لیتی ہے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کے تصور کا رخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ یہ سب کچھ "آسمان سے اترنے والوں" نے کیا ہے، تو وہ اپنی نگاہوں سے بدستور اوجھل رہتی ہے اور آئندہ ایسے خطرات کے مواقع پر اسی قسم کی "روحانی تائید" کے انتظار میں، بیٹھی، زندگی کے ہر شعبے میں شکست کھاتی چلی جاتی ہے یہ ہے وہ خطرہ جس کے پیش نظر ہم نے قوم کے سامنے اس حقیقت کا پیش کرنا ضروری سمجھا ہے کہ جو کچھ اس جنگ میں ہوا ہے وہ تمہارے مقصد کی صداقت، تمہارے یقین کی محکمیت۔ تمہاری استقامت۔ تمہاری جرأت تمہارے ایثار سے ہوا ہے۔ اس کا سہرا تمہارے سر ہے تم نے یہ کچھ کیا ہے۔ تم پھر بھی یہ کچھ کر سکتے ہو اسے یہ بتانا مقصود ہے کہ

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اس کے دل میں اس شعور کا بیدار کرنا مطلوب ہے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

اسے اس امر کا یقین دلانا مقصود ہے کہ

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

معلوم ہوا ہے کہ حکومت ان کارناموں کا، جو جنگ میں سامنے آئے ہیں، ریکارڈ مرتب کرنے کا ارادہ کرتی ہے۔ یہ بڑا مبارک فیصلہ ہے۔ لیکن ہم حکومت سے گذارش کریں گے کہ

(۱) ان داستانوں کو براہ راست متعلقہ لوگوں سے جمع کیا جائے تاکہ یہ امکانی حد تک صحیح معلومات پر مشتمل ہوں۔

(۲) ان میں مبالغہ آمیز افسانوں کو دخیل نہ ہونے دیا جائے۔ نہ ہی انہیں کسی مافوق الفطرت عنصر کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

(۳) انہیں اس انداز سے پیش کیا جائے کہ یہ بلند ہمت انسانوں کے کارناموں کی حیثیت سے سامنے آئیں اور قوم محسوس کر سکے کہ ہم میں کیا کچھ کر سکنے کی قوتیں پنہاں ہیں۔

(۴) اور اس حقیقت کو واضح انداز میں پیش کیا جائے کہ تائید ایزدی کسے کہتے ہیں اور یہ کسے حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ ریکارڈ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے دل میں حیات بخش جذبات اور جرأت آفریں ولولے بیدار کرنے کے لئے مضراب کا کام دیں گے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ڈر ہے کہ قوم کے ان جاں نثاروں کا بے بہا خون، افسانوں کی سرخیاں بن کر رہ جائے گا اور یوں یہ متاعِ گراں بہا ضائع ہو جائے گی۔

ضروری تصحیح

کتاب اسلامی معاشرت (تازہ ایڈیشن) کی فہرست مضامین کے پہلے صفحہ پر ۲ کے سامنے "خدا کے قانون اور اسلام کے قانون" کے بجائے "انسان کے قانون" ہونا چاہیئے ——— اس کی تصحیح کر لیں۔ شکریہ!

(ناظم ادارہ)

جنگ کی برکات

جنگ کی وجہ سے جو تباہیاں اور بربادیاں ملکوں پر آتی ہیں، ان کا ہر ایک کو علم ہے۔ لیکن جنگ کی بعض برکات ایسی ہیں جن کا علم بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ مثلاً سابقہ جنگ عظیم میں اس قسم کی خبریں سامنے آتی رہیں کہ ایک شخص پیدائشی گونگا تھا۔ ایک بم اس کے بچے کے قریب آکر گرا تو وہ اس زور سے چلایا کہ اس کی زبان کی گرہ کھل گئی اور وہ بولنے لگ گیا۔ یا ایک شخص پیدائشی بہرہ تھا۔ گولے کے دھماکے سے اس کے کانوں کے ڈاٹ کھٹ سے نکل گئے اور وہ سننے لگ گیا۔ یا ایک اندھے کی کنپٹی پر ایسا زخم آیا جس سے اس کی ایک رگ پھٹ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے میں اس کی بینائی واپس آگئی۔

ہماری حالیہ جنگ میں بھی اس قسم کے بحیر العقول واقعات ظہور میں آئے ہیں جن سے بہت سے گونگے بولنے لگ گئے۔ کئی بہروں کے کان کے ڈاٹ کھل گئے۔ کئی اندھوں کی آنکھوں سے پٹیاں اتر گئیں اور وہ دیکھنے لگ گئے۔ مثلاً

پاکستان میں اکثر ایسے لوگ تھے جنہیں یہاں ہر قسم کی آسائش میسر تھی۔ ہندوستان کے مقابلہ میں ان کی یہاں حالت بدرجہا بہتر تھی۔ لیکن جب سنئے وہ شکوہ سنج تھے کہ ہم نے پاکستان بنانے میں بڑی غلطی کی۔ ہندوستان کے ساتھ رہنے میں بڑے فائدے تھے۔ ہم خواہ مخواہ یہ حماقت کر بیٹھے۔ انہیں لوگ اٹھارہ برس تک سمجھاتے رہے لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ سنی۔ اب جو جنگ کے گولوں سے دھماکا اٹھا تو ان کے کانوں کے ڈاٹ بھی نکل گئے اور آنکھوں سے پٹیاں بھی اتر گئیں۔ اور وہ اپنی تحریروں اور تقریروں۔ مذاکروں اور گفتگوؤں میں پاکستان کی برکات کے گن گانے لگ گئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

یہاں! ایسے لوگ بھی تھے جنہیں اس بات سے چڑ تھی کہ ہم سیاست میں خدا اور رسول کا نام کیوں لے آتے ہیں! ہم انہیں ہزار سمجھانے کی کوشش کرتے کہ ہماری سیاست، خدا اور رسول کے نام کے بغیر ہماری سیاست

نہیں ہوسکتی، لیکن وہ یہ بات سننا تک نہ چاہتے۔ جنگ کے جو بم پھٹے تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے ایک ایک ٹکڑے کے ساتھ قرآن کی آیات منسلک چلی آرہی ہیں۔

بہروں، گونگوں اور اندھوں کی اس فہرست میں ایک صاحب کا نام سرِعنوان دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ ہیں جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ تحریک پاکستان کے دس سال کے زمانے میں، اور اس کے بعد اٹھارہ سال تک متواتر ہر قسم کی کوشش کی گئی لیکن نہ کوئی معقول بات ان کے کانوں کے اندر پہنچ سکی۔ نہ انہیں کوئی حقیقت اپنی اصل شکل میں دکھائی دی۔ اور نہ ہی کوئی کلمۂ خیر ان کی زبان سے نکلا۔ جنگ کے گولے پھٹے تو چونکہ مرورِ زمانہ سے ان کے کانوں کے ڈاٹ زنگ آلود ہو چکے تھے اور آنکھوں کی پٹیاں پپوٹوں کے ساتھ چپک گئی تھیں، اس لئے وہ ابتدائی ایک ہفتہ، علیٰ حرف (کنارے پر بیٹھے) محو تماشا رہے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ جب اس کے بعد انہیں یقین ہوگیا کہ پاکستان کا پلڑا بہرحال بھاری ہے، تو ان کے کانوں کے ڈاٹ نکلے۔ آنکھوں کی پٹیاں اتریں اور زبان کی گرہ کھلی۔ اور جن حقائق کو وہ مسلسل جھٹلاتے چلے آرہے تھے، ایک ایک کرکے ان کا اعتراف کرنے لگ گئے۔ مثلاً

(۱) تحریک پاکستان کے دوران ان سے کہا جاتا تھا کہ مطالبۂ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک خطۂ زمین حاصل ہو جائے جس میں وہ اسلامی طرز کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس کے جواب میں وہ کہا کرتے تھے کہ

> جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ ..... بلکہ کافرانہ حکومت سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔

(سیاسی کشمکش۔ بحوالہ ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ ۲۹-۲۸)

لیکن جب جنگ کے گولوں کے دھماکوں سے ان کی بینائی واپس آئی تو انہوں نے اپنی نشری تقریروں میں، پاکستان کو جھٹ سے "دارالاسلام" قرار دیدیا اور فرمایا کہ

> جب دارالاسلام کے کسی حصے پر دشمن حملہ آور ہو تو اس کی مدافعت کے لئے تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

(روزنامہ مشرق - ۱۶ر، ۱۸ر ستمبر)

(۲) تحریک پاکستان کے دوران، خود قائد اعظمؒ اور ان کے دیگر ہم نوا، ببانگ دہل، پکار پکار کر کہتے رہے کہ ہم پاکستان اس لئے مانگتے ہیں کہ اس میں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن مودودی صاحب کے کانوں تک یہ آواز نہ پہنچ سکی اور وہ مسلمانوں سے برابر یہی کہتے رہے کہ

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۷)

لیکن اب ان دھماکوں کے بعد ارشاد ہے:۔

> ان حالات میں اہلِ پاکستان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق اپنے اس مقدس ملک کی، جسے اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لئے حاصل کیا گیا تھا، پوری طرح حفاظت کریں۔
>
> (ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ صفحہ ۸)

(۳) ان سے کہا جاتا کہ اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوگی، تو بھی کم از کم اتنا تو مسلم ہے کہ اگر اس آٹھ نو کروڑ (مسلمان) افراد کی قوم کو ایک خطۂ زمین مل جاتے جس میں یہ، ہندوؤں کے تسلط سے آزاد ہو کر اپنی آزاد حکومت قائم کر سکیں، تو وہ صورت بہرحال، ہندوؤں کی محکومی کے مقابلہ میں بہتر ہوگی۔ اس پر یوں محسوس ہوتا گویا ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ ایک بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح اٹھتے اور پورے جوش و خروش کے ساتھ، کف بدھاں، یوں برستے کہ:

> اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رُل مل جائے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ۔ صفحہ ۱۳۵۹۔ صفحہ)

لہٰذا،

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے

کہ ہندوستان میں مسلمان جہاں جہاں کثیر التعداد میں ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے ..... (اور) مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔

(ترجمان القرآن - مئی - جون - ۱۹۴۰ء - صفحہ ۱۱)

حتیٰ کہ

مسلمان کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا جائے۔

(ترجمان القرآن - ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ - صفحہ ۸۴)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں۔

کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لئے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے۔ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہل وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لئے بھی ضروری ہے؟ (ترجمان القرآن - جولائی ۱۹۴۰ء - صفحہ)

آپ نے غور فرمایا کہ اس وقت، مودودی صاحب کے نزدیک، مسلمانوں کے قومی مفاد کا تحفظ، ان کی جداگانہ حکومت ان کے وطن کی آزادی، کا تصور کتنا بڑا جرم عظیم اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کیسا گناہ کبیرہ تھا؟۔ اب دیکھئے کہ جنگ کے گولوں کے دھماکے سے جو قوت سماعت و بصارت واپس آئی ہے تو اسی قوم کے ملی مفاد اور اس کے وطن کی حفاظت کس طرح عین اسلام بن گئی ہے۔ وہ اپنی حالیہ نشری تقاریر میں فرماتے ہیں:

قرآن مجید کے یہ الفاظ اس معاملہ میں بالکل واضح ہیں کہ مسلمانوں کی قومی آزادی اسلام کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے ..... ان الفاظ میں یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ اتنی بڑی اہمیت دیتا ہے کہ یہ کام کرنا گویا اللہ کی مدد کرنا ہے۔

(مشرق - ۱۶ ستمبر)

اس سے اگلی تقریر میں فرماتے ہیں،

اللہ تعالیٰ ہی نے یہ ملک ہمیں عطا فرمایا ہے[1]۔ اسی کے فضل سے ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ دنیا میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کریں ...... جس قوم کو آزاد رہنا ہو اسے لازماً آزادی کی قیمت دینی ہوگی۔ ہم آزادی حاصل کرنے کی قیمت اور بڑی بھاری قیمت، دے چکے ہیں۔ اب ہمیں اس آزادی کو برقرار رکھنے کی قیمت بھی دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

(مشرق - ۱۸ر ستمبر)

آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی یہ قوم باقی رہے یا فنا ہو جائے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اب فرماتے ہیں:

(ایک فرد کو معلوم ہونا چاہیئے کہ) اس کی عافیت ساری قوم کی عافیت کے ساتھ ہے۔ اگر قوم رہے گی تو وہ بھی رہے گا۔ اور اگر خدانخواستہ قوم ہی نہ رہی تو پھر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ (مشرق - ۲۰ر ستمبر)

مودودی صاحب! یہ تھی مسلمان قوم کے تحفظ کی اہمیت، اور ان کی وطنی آزادی کی قدر و قیمت، جس کا واسطہ دلا کر آپ سے کہا جاتا تھا کہ مطالبۂ پاکستان کی مخالفت سے باز آجائیے اور اس سے آپ کی دشمنی اور بڑھتی چلی جاتی تھی۔ اس مخالفت سے آپ کس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے تھے، اس کے متعلق خود اپنی زبان سے سن لیجیے۔ آپ نے اپنی حالیہ نشری تقریر میں کہا ہے:

جب ملتِ اسلامیہ اپنی زندگی اور موت کی اس کشمکش میں مبتلا ہو اور مسئلہ یہ پیدا ہوگیا ہو کہ اس سرزمین میں خدائے واحد کا نام لینے والوں کو آزادی اور عزت کے ساتھ رہنا ہے یا نہیں، اس وقت اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا ہے جو اپنے بقا کے لئے ملت کی کوششوں کو نقصان پہنچانے والا ہو، تو وہ کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ (مشرق - ۲۰ر ستمبر)

تحریک پاکستان کے دوران ملتِ اسلامیہ اپنی زندگی اور موت کی اسی کشمکش میں مبتلا تھی اور مسئلہ یہ پیدا ہوگیا تھا کہ اس سرزمین میں خدائے واحد کا نام لینے والوں کو آزادی اور عزت کے ساتھ رہنا ہے یا نہیں۔ تحریک

---

[1] یہ بالکل صحیح ہے کہ اللہ ہی نے یہ ملک مسلمانوں کو عطا کر دیا ورنہ آپ تو اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔

آپ نے اپنی اس مذموم کوشش میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی کہ ملت اپنی بقا کے لئے جو کوششیں کرتی ہے وہ ناکام رہ جائیں۔ آپ نے اس سے جس گناہ عظیم کا ارتکاب کیا تھا، کیا آپ نے اس کا اعتراف بحضورِ ملت کیا ہے؟

(۴) یہی قوم، جس کی حفاظت کے لئے ہر کوشش کو اب جہاد قرار دیا جا رہا ہے، اس کے متعلق ارشاد ہوتا تھا:

> یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں۔ نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔
>
> (ترجمان القرآن - محرم ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ ۲۷)

حتیٰ کہ اسے یہ "چڑیا گھر" کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

(ترجمان القرآن - ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ - صفحہ ۲۷)

جب ان سے کہا جاتا کہ یہ قوم جیسی تیسی بھی ہے، اسے باقی رہنے دیا جائے تو اس سے کسی دن خیر کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ بہرحال، ہندوؤں سے تو بہتر ہیں۔ لیکن اس پر یہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) نہایت حقارت آمیز انداز سے فرما دیتے کہ میرے نزدیک اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ یہ باقی رہیں یا ہندوؤں میں جذب ہو جائیں۔ اب اسی قوم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

> ہماری فوجوں نے اس زمانے میں ان اوصاف کا مظاہرہ کیا ہے جو کبھی قرونِ اولیٰ کے مسلمان فوجیوں کے متعلق ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے.....
> ہماری قوم نے فوج کے ساتھ ایسا بھرپور تعاون کیا ہے جو شاید ہی دنیا کی کوئی قوم اپنی فوج کے ساتھ کرتی ہو..... ہمارے تاجروں نے اس زمانے میں اس اخلاق کا ثبوت دیا ہے جو شاذ و نادر ہی کسی قوم کے تاجر جنگ کی حالت میں پیش کیا کرتے ہیں..... ہمارے تمام کارکنوں نے خواہ وہ حکومت کے کسی محکمے میں ہوں یا قومی معیشت کے کسی شعبے میں، اس موقع پر نہایت تن دہی اور پورے جذبۂ جہاد کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے ہیں.....

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مختصر سی مدت میں پوری قوم کی اخلاقی حالت بدل کر رہ گئی ہے۔ (مشرق - ۲۶/اکتوبر ۱۹۶۵ء)

یہ وہی قوم ہے جس کے زندہ رہنے یا فنا ہو جانے سے آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا تھا!!

(ت) جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مودودی صاحب نے ہندی مسلمانوں کی قومی حیثیت کو بنظرِ حقارت دیکھنے کے ساتھ ہی ترکی اور ایران کو بھی رگید ڈالا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کا قومی وجود بھی باقی رہے یا نہ رہے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اب، پاکستان کے خلاف جنگ کے سلسلہ میں، (اخبارات میں شائع شدہ اطلاعات کے مطابق) مودودی صاحب نے انہی مسلمانوں کی سلطنتوں سے تائید حاصل کرنے کے لئے، انہیں خطوط لکھے ہیں۔

فرمائیے! اگر آپ کے نظریہ کے مطابق (خدا نکردہ) ان حکومتوں کا وجود باقی نہ رہتا، تو آپ آج انہیں مدد کے لئے کس طرح پکارتے؟

ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ مودودی صاحب نے "کافرانہ حکومت" اس زمانے میں کہا تھا۔ اب تو وہ ایسا نہیں کہتے۔ سو جب حکومت کافرانہ نہیں، تو پاکستان کے دارالاسلام ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ مودودی صاحب اب بھی اس حکومت کو کافرانہ ہی قرار دیتے ہیں۔ حالیہ جنگ کا آغاز ابتدائے ستمبر میں ہوا تھا۔ اور ستمبر ۱۹۶۵ء ہی کے ترجمان القرآن کے اشارات میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں۔

> غیب کا علم تو خدا کو ہے لیکن ہمارے اس ملک کا برسرِ اقتدار طبقہ اسلام کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ اگر اس کے انفرادی تقاضوں سے نہیں تو کم از کم اس کے اجتماعی تقاضوں سے ضرور گلو خلاصی حاصل کرنے کا آرزومند ہے وہ اس مقصد کو ڈنکے کی چوٹ حاصل کرتا لیکن چونکہ قوم ابھی اس بات پر آمادہ نظر نہیں آتی اور اس بنا پر اس کے اندر قیادت و سیادت قائم کرنے کے لئے اسلام کی محبت کا دم بھرنا ناگزیر ہے اس لئے مختار راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ کافرانہ افکار و نظریات اور ملحدانہ تصورات کے ساتھ اسلام کو چپکائے رکھا جائے۔ (صفحہ ۳)

اور اگر یہ کہا جائے کہ مودودی صاحب کے نظریہ میں اب یہ نمایاں تبدیلی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ دستور پاکستان میں یہ شق رکھ دی گئی ہے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے۔ اس یقین دہانی سے یہ ملک دارالاسلام بن گیا ہے۔ تو اس کا کیا جواب ہے کہ یہ یقین دہانی (کہ پاکستان اسلامی نظام حیات کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے) تحریک پاکستان کے روزِ اول سے دی جا رہی تھی۔ اُس وقت، اس یقین دہانی کے باوجود، اس کی مخالفت کیوں تقاضائے دین قرار پا رہی تھی۔ اور آج اس کی حمایت کیوں عین مطابق شریعت ہے؟ اس یقین دہانی کے متعلق ہم سے نہیں، خود انہی حضرات کی زبانی سنئے۔ ترجمان القرآن کی جون ۱۹۶۵ء کی اشاعت کے اشارات ان الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔

> برعظیم ہند کے سینکڑوں اور ہزاروں نہیں، بلکہ کروڑوں باشندے اور پوری دنیا کا پریس اس حقیقت پر گواہ ہے کہ تحریک پاکستان کے پیچھے نہ تو کوئی سیاسی غرض کارفرما تھی اور نہ معاشی مصلحت۔ اس کا محرک صرف ایک ہی جذبہ تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا الگ خطۂ ارض مل جائے جس میں وہ بڑی آزادی کے ساتھ اسلامی نظام حیات نافذ کر سکیں۔

ذرا آگے چل کر لکھا ہے:

> یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ نظریۂ پاکستان کے بانی اور تحریک پاکستان کے قائد ہر موقع پر مسلمانوں کو یہی کہتے رہے کہ اس ملک کے قیام کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ یہاں اسلام کی ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کی جائے جس سے مادی تہذیب سے ستائی ہوئی انسانیت آرام اور سکون حاصل کر سکے۔[1]

بہرحال، یہ ہیں جنگ کی وہ برکات جن کا ظہور ہمارے ہاں اس طرح ہوا ہے۔ ان تمام تضادات کے باوجود جن کی تفصیل آپ کے سامنے آچکی ہے یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مودودی صاحب نے بالآخر ان حقائق کا اعتراف کر لیا جن کی مخالفت ان کا شیوۂ زندگی بن چکا تھا۔ خدا کرے کہ مودودی صاحب جو کچھ اب فرما رہے ہیں وہ ان کے دل کی آواز ہو۔ یہ بھی وہ جھوٹ نہ ہو جس کا بولنا "عملی زندگی کی بعض ضروریات" کے لئے "ان کی شریعت میں، جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔" (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء - صفحہ ۴۳)۔

---

[1] ممکن ہے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مودودی صاحب نے اُس زمانے میں تو کہا تھا کہ مسلم لیگ کے لیڈروں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا تھا۔ اور اب یہ کہا جا رہا ہے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ ان کی ساری زندگی اسی قسم کے تضادات کا مجموعہ ہے۔

خورشید عالم

سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

نگہ بازگشت ڈالئے اور سوچئے کہ کشمیر کا تنازعہ کیسے پیدا ہوا اور کس طرح بڑھتے بڑھتے پاکستان اور بھارت کے درمیان اس مسلح تصادم کا باعث بن گیا۔ جو کیفیت اور خوفناکی میں دوسری عالمگیر جنگ کا ہم پلہ قرار دیا گیا اور تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ اتنا قریب لے آیا کہ عالمی قوتوں کے ایوان ہائے حکومت لرز اٹھے ہیں۔ ایک بار نہیں بار بار دیکھئے۔ ہر بار یہ حقیقت ابھر نکھر کر سامنے آتی جائے گی کہ اس کی علت ایک طرف بھارت کی مکاری ہے اور دوسری طرف پاکستان کی امن پسندی۔ دونوں ممالک کا ردعمل ان کے مخصوص قومی مزاج کا مظہر ہے اور حسب عادت، دونوں نے اس کا خوب ہی مظاہرہ کیا۔

پاکستان کو ایسا ہمسایہ ملا ہے کہ اس کی دوستی پر اعتبار نہیں اور دشمنی میں مزہ نہیں۔ اس میں نہ خلوص ہے کہ ایک شریف کا دل موہ لے اور نہ مردانگی کہ ایک بہادر سے بے ساختہ داد تحسین لے۔ اس ہمسائے کے منہ میں تو رام رام ہے لیکن بغل میں چھری ہے آزادی سے پہلے اس چھری کا بے محابا استعمال ہوتا رہا تھا۔ آزادی کے بعد یہ چھری، ایسی بے دریغی سے چلتی رہی کہ اسکا بہایا ہوا دریائے خون دونوں آزاد ہمسایوں میں دائمی حد فاصل بن گیا۔

برصغیر میں آزادی کی پو پھٹی تو غلامی کی شب تار سے دو آزاد ممالک نمودار ہوئے۔ پاکستان اور بھارت ان علاقوں پر مشتمل تھے جنہیں برطانوی ہند کہا جاتا تھا۔ برصغیر کا وہ حصہ جو راجوں مہاراجوں کی ریاستوں پر مشتمل تھا، ان میں شامل نہ تھا۔ یہ چھوٹی بڑی ریاستیں، جن کی تعداد چھ سو کے لگ بھگ تھی، برطانوی حاکمیت کے تحت تھیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ حاکمیت ختم ہو گئی تو سوال پیدا ہوا کہ ان کا کیا ہو۔ ۲۵ جولائی کو انہیں برصغیر کے انگریز وائسرائے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، یہ مشورہ دے چکے تھے کہ ان کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دونوں میں سے ایک

ملک سے باقاعدہ الحاق کرلیں۔ اور ایسا کرنے میں جغرافیائی، معاشی اور معاشرتی ملحوظات کو پیش نظر رکھیں۔ ریاستوں کو الحاق کا فیصلہ کرنے کے لئے مہلت دینے کے خیال سے یہ طے ہوا کہ وہ پاکستان یا بھارت سے استقرارِ کار کا معاہدہ کرلیں تاکہ نظم و نسق بدستور سابق چلتا رہے۔ بھارت نے اس قدم اول پہ ہی فتنہ برپا کر دیا۔ اس نے اصرار کیا کہ جو ریاستیں اس کے ساتھ استقرارِ کار کا معاہدہ کریں وہ ساتھ کے ساتھ فوراً الحاق بھی داخل کر دیں۔ اس کے ساتھ اس نے یہ مفسدانہ اور منافقانہ تجویز پیش کی کہ بعد میں بھارت اور متعلقہ ریاست کی حکومتوں کی نگرانی میں استصواب کرا لیا جائے گا۔ بھارت کی چال بالکل واضح تھی۔ وہ ریاستوں پر تو پہلے دن سے ہی قبضہ کر لینا چاہتا تھا لیکن دنیا کو دکھانے کے لئے بعد میں اہل ریاست سے اپنے دباؤ میں لاکر یہ کہلوا لینا چاہتا تھا کہ انہیں بھارت سے الحاق منظور ہے۔ اس سے زیادہ شرانگیز تجویز نہیں ہو سکتی تھی۔ پاکستان نے اسے نہ قبول کیا اور نہ اپنے طور پر آزمایا۔

بھارت کے پاس انگریز وائسرائے تھا اور انگریز کا ریاستوں میں بہت اثر و دخل تھا۔ اس وائسرائے کی مدد سے بیشتر ریاستوں کو الحاق پر مجبور کر لیا گیا، البتہ تین ریاستیں ایسی رہ گئیں جن کا الحاق سنگین نزاع کا باعث بن گیا۔ یہ ریاستیں تھیں: جوناگڑھ، حیدر آباد اور کشمیر۔ بھارت کا رویہ معقول ہوتا تو کسی قسم کا تنازعہ برپا نہ ہوتا۔ ہر چند بھارت سے صفائی معاملہ کی توقع عبث تھی، پاکستان اس خوش فہمی میں رہا کہ معاملہ صلح و صفائی سے طے ہو جائیگا۔ تا آنکہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت اپنا سارا لاؤ لشکر لے کر اور بغیر اعلان جنگ کئے اس کی سرحدوں میں گھس آیا۔ بہرکیف جوناگڑھ کے مسلمان نواب نے یہ صورت قبول نہ کی کہ بھارت سے پہلے دن سے ہی الحاق کر لیا جائے۔ اس نے ۱۵ اگست کو پاکستان سے استقرارِ کار کا معاہدہ کیا اور ایک مہینے کے بعد یعنی ۱۵ ستمبر کو پاکستان سے الحاق کر لیا۔ بھارت کی نیت صاف ہوتی تو شاید یہ صورت نہ پیدا ہوتی۔ استقرارِ کار اور الحاق کا فیصلہ ہر چند مسلمان نواب نے کیا، اس کی ہندو رعایا نے، جن کی تعداد سات لاکھ آبادی میں چھ لاکھ تھی، نہ تو اس اقدام کے خلاف کسی قسم کی ناراضی کا اظہار کیا اور نہ کوئی مظاہرہ کیا۔ ریاست کے ہندو تو خاموش رہے۔۔۔ شاید انہیں پاکستان سے ملنے پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا ——— لیکن ان کی ہمدردی کا مروڑ بھارت کے پیٹ میں اٹھا۔ اس کے گورنر جنرل نے ۲۲ ستمبر کو پاکستان کے گورنر جنرل کے نام احتجاجی تار میں جوناگڑھ کو بھارت کا علاقہ قرار دیا۔ اس تار میں یہ تجویز دہرائی گئی کہ بھارت' ریاست کی حکومت، سے مل کر استصواب کرانے کے لئے تیار ہے۔ گویا بھارت کا موقف یہ تھا کہ جوناگڑھ اس سے الحاق کرے اور پھر بھارت اپنی نگرانی میں استصواب کرا کے دنیا کو دھوکا دینے کے لئے اس پر عوامی پسند کی مہر لگوا لے۔

یہ تجویز تو بھارت نے دہرا دی لیکن اس نے یہ انتظار نہیں کیا کہ پاکستان سے اس پر کسی قسم کی مفاہمت

کرے۔ اثنا اس نے اپنی فوجیں لے کر جوناگڑھ پر حملہ کر دیا اور ریاست پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس جارحیت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ کیونکہ دونوں ممالک متنازعہ فیہ ریاستوں کے الحاق سے متعلق متفقہ فیصلہ کر سکتے تھے۔ بھارت نے ایسا فیصلہ نہیں ہونے دیا اور وہ فوجی کارروائی پہ اتر آیا۔ جوناگڑھ کے الحاق پاکستان کو کس زاویۂ نگاہ سے کیوں نہ دیکھا جائے اس سے یہ سوال واضح طور پہ سامنے آگیا تھا کہ جوناگڑھ، حیدر آباد اور کشمیر کی ریاستوں کے الحاق کا فیصلہ عوام کو کرنا چاہیئے یا حکمرانوں کو۔ یہ مسئلہ آپس میں طے کیا جا سکتا تھا۔ بھارت نے نہ محض اس سے گریز کیا بلکہ تینوں ریاستوں میں اس نے فوج کے زور پر ہی فیصلہ کیا۔ وہ جوناگڑھ کو فتح کر چکا تو اس نے ۱۰ر نومبر ۱۹۴۷ء کو یہ تجویز پیش کی کہ جن ریاستوں کے عوام اور حکمران ایک ہی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے، ان کے الحاق کا فیصلہ عوام کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔

پاکستان نے بجا طور پر اس کا جواب یہ دیا کہ جب تک جوناگڑھ بھارت کے فوجی قبضے میں ہے وہاں استصواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن بھارت نے اپنی فوجیں واپس نہیں بلائیں اور سنگینوں کے سائے میں استصواب کر کے الحاق اپنے حق میں کرا لیا۔

پاکستان کی نیت میں بھارت کی طرح فتور ہوتا تو وہ بھارت کا یہ موقف تسلیم کر لیتا کہ ریاستیں متعلقہ ملک سے فوری الحاق کر لیں اور پھر بعد میں اس ملک کی نگرانی میں استصواب کرایا جائے۔ اس طرح کشمیر کا الحاق پہلے دن سے ہی پاکستان سے ہو جاتا۔ لیکن پاکستان نے یہ معقول رویہ اختیار کیا کہ دونوں ممالک آپس میں کوئی اصول وضع کر لیں اور پھر اس کے مطابق الحاق کا مسئلہ صلح و صفائی سے طے کر لیا جائے۔ بھارت نے جوناگڑھ میں کوئی اصول وضع نہیں ہونے دیا اور فوجی کارروائی کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ جوناگڑھ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس کا پاکستان سے الحاق نامناسب تھا، لیکن نامناسب تو جب کہا جا سکتا ہے کہ مناسب کا تعین کر لیا گیا ہوتا۔ بھارت تو ہر حال میں ریاستوں کا الحاق اپنے ساتھ چاہتا تھا۔ جہاں ایسا نہیں ہوا وہاں اس نے زبردستی الحاق کرا لیا۔ اسے عوام کی منشا کا کوئی لحاظ نہ تھا۔ عوام کو تو وہ دنیا کو فریب دینے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اصرار تھا کہ ریاستیں پہلے سے ہی اس سے الحاق کر لیں اور پھر وہ اپنی مرضی سے استصواب کرا لے۔ بھارت سے الحاق کے بعد بھارت ہی کی نگرانی میں کرایا ہوا استصواب بھارت کے خلاف کیسے جا سکتا تھا؟ وہ ایسا ہی اصول پرست ہوتا تو جوناگڑھ کے معاملہ میں پاکستان سے مذاکرات کے ذریعہ مفاہمت کرتا اور فوج لے کے یلغار نہ کر دیتا۔ اور پھر یہ محض اتفاق نہیں کہ اس نے جوناگڑھ میں فوج استعمال کی۔ حیدر آباد میں اور کشمیر میں بھی اس نے یہی کچھ کیا اور فوجی کارروائی کر کے دونوں ریاستوں پر قبضہ جما لیا۔

اگر بغرض استدلال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بھارت کو جوناگڑھ میں غالب ہندو آبادی کے مفاد کی خاطر پرامن ذرائع کو چھوڑ کر فوجی کارروائی ایسے انتہائی اقدام کا حق تھا تو پھر پوچھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کشمیر پر کس منہ سے فوجیں

لے کے چڑھ دوڑا تھا؟ کشمیر میں فوجی کارروائی کا یہ جواز بتایا گیا ہے کہ مہاراجہ نے بھارت سے الحاق کر لیا تھا۔ جوناگڑھ کا الحاق بھی تو پاکستان سے ہو چکا تھا! جوناگڑھ پر حملہ کر کے بھارت نے صاف طور پر پاکستان پر حملہ کیا تھا۔ جہاں تک کشمیر کے الحاق کا تعلق ہے کون نہیں جانتا کہ مہاراجہ نے بھارت سے اس حال میں الحاق کیا کہ وہ عوامی بغاوت کی وجہ سے ریاست سے بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جوناگڑھ میں الحاق کے خلاف معمولی سے معمولی مظاہرہ نہیں ہوا تھا لیکن کشمیر میں مہاراجہ کے خلاف منظم بغاوت رونما ہو گئی تھی۔ پھر کشمیر نے پاکستان سے استقرار کار کا معاہدہ کر رکھا تھا بھارت سے نہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر بھارت نے مہاراجہ کی طرف سے پیش کی ہوئی مزعومہ الحاق منظور کی تو اسے ماضی قرار دیا اور یہ اعلان کیا کہ حالات معمول پر آجانے پر ریاست میں الحاق سے متعلق استصواب ہوگا۔ بعد میں جب معاملہ اقوام متحدہ میں پہنچا تو بھارت نے یہ تجویز منظور کر لی کہ استصواب اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہوگا۔ یہ سب اس کی صریح مکاری تھی اور پاکستان نے سادہ دلی سے اس پر یقین کر لیا۔ بھارت اہل کشمیر کی خودارادیت کا قائل تھا نہ ہے۔ وہ یہ ڈھونگ رچا کر اپنی ناقابل جواز فوجی کارروائی اور کشمیر اور پاکستان کے خلاف عریاں جارحیت پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔

مہاراجہ کشمیر کا الحاق اضطراری فعل نہیں تھا۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔ اس سازش میں انگریز بھی شریک تھا اور بھارت کا اونچے سے اونچا ہندو لیڈر بھی۔ اس سازش میں ریڈکلف ایوارڈ بنیادی قدم تھا۔ اس کے مطابق پاکستانی سرحدوں کا قصداً غلط تعین کیا گیا اور ایسے مسلمان آبادی کے علاقے بھارت کے سپرد کر دیئے گئے جو ہر لحاظ سے پاکستان کا حصہ تھے۔ یوں دھاندلی سے بھارت کے لئے کشمیر تک پہنچنے کا راستہ بنایا گیا۔ پاکستان اور بھارت ابھی معرض وجود میں نہیں آئے تھے کہ ہندو لیڈروں نے مہاراجہ کشمیر کو ورغلانے شروع کر دیئے تھے کہ وہ بھارت سے الحاق کرے۔ اس سازش میں مسٹر گاندھی پوری طرح شریک تھے۔ وہ جولائی میں کشمیر گئے اور مہاراجہ کو الحاق پر مجبور کر آئے۔ مسٹر گاندھی کے متعلق بڑی سادگی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کے حامی تھے لیکن یہ آنجہانی کے دورے کا اثر تھا کہ مہاراجہ نے رام چندر کاک کو وزارت اعلیٰ کے عہدے سے ہٹا کر ان کی جگہ ایک ڈوگرے راجپوت کو متعین کر دیا تھا۔ معزول وزیراعلیٰ آزادی کشمیر کے قائل تھے۔ اس لئے انہیں راستے سے ہٹا دیا گیا۔ گاندھی کے دورے کے بعد ہی ریاست بھر میں ایسے اقدامات کئے جانے لگے تھے کہ وقت آنے پر کشمیر کا پاکستان سے الحاق ناممکن ہو جائے۔ مسلمانان کشمیر کے منظم قتل و غارت کا سلسلہ بھی اسی تاریخی دورے کے بعد شروع ہوا تھا۔ اتنے اونچے پیمانے پر سازش ہو رہی ہو تو بھارت کے کسی لیڈر کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اصول پرست تھا یا ہے خود فریبی کی انتہا ہے۔ اس پس منظر میں جوناگڑھ کا پاکستان سے الحاق ایسا نہیں جسے مناسب یا نامناسب کہہ کر یاد کیا جائے۔ جوناگڑھ تو ایسا ٹیسٹ کیس بن گیا تھا کہ اس کے معقول

تصفیہ سے کشمیر اور حیدر آباد کے معقول تصفیے کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ بھارت نے تینوں جگہ مکاری سے کام لیا اور پاکستان، اپنی عادت سے مجبور امن پسندی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اس لئے برصغیر میں جنگ کے شعلے بھڑکانے سے احتراز کیا اور اپنے علاقے پر بھارت کو قبضہ کرنے دیا۔ پاکستان کشمیر کے معاملہ میں بھی خاموش رہا۔ حالانکہ کشمیر پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور ہے۔ کسی قوم کے لئے جان کی بازی لگا دینے کے لئے اس سے بڑی وجہ جواز نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی اور قوم ہوتی تو کشمیر جیسے تنازعہ کے لئے برسوں پہلے جنگ کی طرح ڈال چکی ہوتی۔ پاکستان نے امن کا راستہ اختیار کیا تو اس نے دوہرا دھوکہ کھایا۔ ایک طرف اس نے یہ فرض کر لیا کہ آزاد بھارت تہذیب، شائستگی اور امن کی راہ اختیار کرے گا اور دوسری طرف یہ کہ اقوام متحدہ جیسا عالمی ادارہ حق و انصاف سے کام لے گا اور کشمیر کے منصفانہ حل میں مخلصانہ مدد دے گا۔ دونوں مفروضے غلط تھے۔ بھارت اور اقوام متحدہ دونوں نے پاکستان کو دھوکے میں رکھا اور بڑی دیدہ دلیری سے پاکستان دھوکہ کھاتا رہا تا آنکہ ستمبر میں بھارت نے پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا[1]۔ اس کھلی جارحیت کی مذمت نہ اقوام متحدہ نے کی اور نہ اس کی رکن بڑی طاقتوں نے۔ البتہ ان کی کوشش یہ ہو گئی کہ محاذ جنگ پر بھارت نے جو شکست کھائی ہے اسے سیاسی محاذ پر فتح میں تبدیل کیا جائے۔ چنانچہ بھارت کے واویلا کرنے پر اقوام متحدہ کی وساطت سے جنگ بند کرا دینے کا مقصد یہ بروئے کار لا کر یکم جنوری کی سی صورت حال پھر سے پیدا کی جا رہی ہے۔ پاکستان کو پھر وہی دھوکا دیا جا رہا ہے جو اسے اٹھارہ سال تک دیا جاتا رہا۔

بھارتی جارحیت نے پاکستان کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب نہ کشمیر دھوکہ کھا سکتا ہے نہ پاکستان۔ اب نہ بھارت کی نیت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ نہ اقوام متحدہ کی ضمانت پر یقین کر سکتا ہے۔ کشمیر اور پاکستان دونوں نے دیکھ لیا ہے کہ اس تنازعہ کا حل ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ غلامی سے امتوں کی نجات — خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے — اور پاکستان نے ستمبر کے تاریخی معرکے میں برای العین دیکھ لیا کہ امتوں کے مرض کہن کا چارہ اس کے علاوہ اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ غازیان پاکستان کے سامنے اپنی اور تاریخ کے وہ اوراق ہیں جنہیں خامہ حق نے اس لئے خالی چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے قلم سے اپنی سرگزشت لکھیں اور دنیا پر ایک بار پھر ثابت کر دیں کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

یہ سرگذشت لکھی جا رہی ہے۔ اسے نہ ہاتھ روک سکتا ہے نہ قلم ختم کر سکتا ہے۔

---

[1] یہ غنیمت تھا کہ اس دوران میں، موجودہ حکومت نے اتنی فوجی تیاری کر لی تھی کہ جس وقت بھارت پوشیدہ مکاری سے کھلی جارحیت پر اتر کر سامنے آجائے تو اسے دندان شکن جواب دیا جا سکے۔ اگر اس کی طرف سے اس قسم کا حملہ کہیں آج سے آٹھ دس سال پہلے ہو جاتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ (طلوع اسلام)

صفدر سلیمی

مسئلہ کشمیر

سامراجی وحشت و بربریت کی جس آگ نے گذشتہ اٹھارہ برس سے کشمیر کی جنت ارضی کو بھسم کر رکھا تھا اس کے تند و تیز شعلے اب جموں و کشمیر کے پہاڑوں اور وادیوں میں محدود نہیں رہے بلکہ پورے برصغیر کا امن و سکون ان کی لپیٹ میں آچکا ہے اور عجب نہیں کہ ان شعلوں کی ہمہ گیری بہت جلد تیسری عالمگیر جنگ کو حرکت میں لے آئے اور پوری دنیا ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہو جائے جس کی تہلکہ انگیزیوں کی زد سے عالم انسانی کا کوئی گوشہ محفوظ نہ رہ سکے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر آج اقوام عالم کی نگاہیں مرکوز ہیں اور دنیا کی ہر امن پسند طاقت دل سے یہ چاہتی ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی مؤثر حل بروئے کار لا کر اس خطہ میں امن و سکون بحال کرنے کی دیانتدارانہ سعی و کاوش سے کام لیا جائے۔

مسئلہ کشمیر سے پاکستان کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس تنازعہ میں ہم نہ صرف ایک اہم فریق کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اس کے لئے ہر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے چکے ہیں اور اس راہ میں بڑے سے بڑا چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس مسئلہ کی مذکورہ اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ امر باعث تعجب ہوگا کہ خود پاکستان میں بھی عوام کو ان تاریخی حقائق کی پوری تفصیل معلوم نہیں جو اس مسئلہ کے پس منظر میں کارفرما چلے آرہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ بھارت نے اٹھارہ سال سے کشمیر کے عوام کی مرضی کے خلاف ان پر بزور اپنا سامراجی تسلط جما رکھا ہے۔ اور پاکستان مجبور ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں کی مظلومی میں ان کا ساتھ دے اور انہیں بھارتی چنگل سے آزاد کرانے میں کوشاں ہو۔ یہ بات غلط نہیں۔ لیکن اصل معاملہ اس سے کہیں گہرا ہے۔ اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے اور اس پس منظر کا سلسلہ تقاصل برصغیر کی اس تقسیم سے مربوط ہے جس نے پاکستان اور بھارت کی دو الگ الگ مملکتوں کو جنم دیا۔ اس تقسیم کی جزئیات طے کرتے ہوئے جن سازشوں، ہتھکنڈوں اور ریشہ بازیوں سے کام لیا گیا ان سے مسئلہ کشمیر کو الگ رکھا نہیں جا سکتا۔

مطالبۂ پاکستان کو تسلیم کر لینے کے بعد اگر دیانتداری سے کام لیا جاتا تو بات بڑی سیدھی اور صاف

مطالبۂ پاکستان اور دیانتداری کا تقاضا

تھی اور وہ یہ کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے انضمام سے پاکستان کا قیام عمل میں آجاتا اور ہندو اکثریت کے صوبوں پر مشتمل بھارت کی مملکت وجود میں آجاتی۔ امن و سلامتی کا یہ واضح راستہ اختیار کرنے سے نہ تو مسئلۂ کشمیر کا کوئی امکان ابھرتا اور نہ بھارت اور پاکستان میں وہ تلخیاں رونما ہوتیں جو انہیں ایک دوسرے کے مقابل آج تک برابر صف آرا کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اسے کروڑوں انسانوں کی بدقسمتی سمجھئے کہ ایسا ممکن نہ ہوا۔ پنجاب و بنگال کی تقسیم، صوبہ سرحد جیسے واضح مسلم اکثریت کے صوبے میں استصواب رائے کا ڈھونگ، صوبوں، ضلعوں، تحصیلوں اور تھانوں تک کی کانٹ چھانٹ اور اس کانٹ چھانٹ کے ذریعے بھارت کا جموں سے میل ملاپ۔ سوچئے کہ یہ ذلیل ترین اور شرمناک ہتھکنڈے آخر کس گھناؤنی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں؟

بدترین سازش

کہا جائے گا (اور ہمیشہ یہی کہا جاتا ہے) کہ اس ساری شیطنت کا کرتا دھرتا انگریز اور صرف انگریز تھا۔ یہ سارے مسائل اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اس نے مسلمانوں سے اپنی تاریخی دشمنی کا بدلہ چکا دیا ہے۔ وہ صلیبی جنگوں کے دور کا زہر ابھی تک اپنے سینوں میں لئے ہوئے ہے۔ عیسائی ہمیشہ مسلمانوں کے دشمن رہے ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے، ضرب کاری لگانے سے نہیں چوکتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ تقسیم ہند کے موقع پر ہمیں جو کاری زخم کھانے پڑے یہ محض انگریز کی اسلام دشمنی کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ ان میں خود ملت اسلامیہ کے "جلیل القدر رہنماؤں" اور "ارباب جبہ و دستار" کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ یہ بہرحال ایک الگ داستان ہے۔ جہاں تک مسئلہ کشمیر کا تعلق ہے، تقسیم ہند کے سلسلہ میں اصولاً طے ہو چکا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان میں شامل ہوں گے۔ مسلم لیگ نے تقسیم کو اسی اصول کے تابع تسلیم کیا تھا۔ لیکن (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مشہور کتاب INDIA WINS FREEDOM) سے واضح ہے کہ لارڈ مونٹ بیٹن نے پہلے ہی کانگریسی راہ نماؤں کو اپنی اس خبیث سازش سے مطلع کر دیا تھا کہ وقت آنے پر وہ یہ کہے گا کہ "مسلم علاقوں" سے مراد وہ صوبے نہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے بلکہ ان صوبوں سے ان اضلاع اور ان تحصیلوں تک کو الگ کر دیا جائے گا جن میں مسلمان اکثریت میں نہیں۔ اس نے کانگریسی راہ نماؤں سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اُس وقت خاموش رہیں وقت آنے پر وہ یہ سب کچھ خود ہی کر لے گا۔ (یہ سب کچھ مولانا آزاد نے اپنی محولہ بالا کتاب میں صراحت سے لکھا ہے) چنانچہ وقت آنے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ مہرہ آگے بڑھایا اور "علاقوں" کی اس انوکھی تعبیر کی رو سے، گورداسپور کے ضلع سے تین تحصیلیں (بٹالہ۔ گورداسپور۔ اور پٹھانکوٹ) الگ کر کے ہندوستان کے ساتھ ملا دیں اور اس طرح ہندوؤں کے لئے کشمیر تک پہنچنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اگر

اکثریت کے اصول کے مطابق سارا پنجاب (یا گورداسپور کا پورا ضلع) پاکستان کے ساتھ رہتا تو ہندوستان کے لئے کشمیر تک جانے کا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ اس طرح مسئلہ کشمیر کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے ذرا توجہ سے سنئے۔

ریاستوں کے الحاق کا بنیادی اصول

یہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کا تاریخی دن تھا جس کی شام کو لارڈ مونٹ بیٹن کی وساطت سے حکومت برطانیہ نے اس برصغیر سے اپنے اقتدار کے خاتمے کا اعلان کیا اور یہاں کی دو بڑی قوموں کی الگ الگ مملکتوں کی طرح ڈال دی گئی۔ مونٹ بیٹن ایوارڈ کے ذریعے جہاں ملک معظم کی حکومت برطانوی ہند میں اپنے تسلط سے دستبردار ہو گئی۔ وہاں اس نے ریاستہائے ہند پر بھی اپنی وہ سیادت کلیتہً ختم کر دی جو مختلف معاہدوں کی رو سے اسے سالہا سال سے حاصل چلی آرہی تھی۔ اور والیان ریاست کو یہ حق دیدیا گیا کہ وہ پاکستان اور بھارت دونوں میں سے جس مملکت کے ساتھ چاہیں، یا ضابطہ الحاق کے ذریعے اپنی ریاست کی قسمت وابستہ کر لیں۔ اس تاریخی اعلان کے چند ہی بعد لارڈ مونٹ بیٹن نے والیان ریاست کا ایک خصوصی اور آخری اجلاس طلب کیا جس میں برصغیر کی ۵۶۵ ریاستوں کے والی یا ان کے نمائندے شریک ہوئے۔ اجلاس میں گورنر جنرل موصوف نے سب پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ کرتے ہوئے انہیں لازماً حسب ذیل حقائق پیش نظر رکھنے پڑیں گے۔ یعنی ــــ

> نہ تو انہیں یہ حقیقت نظر انداز کرنی چاہیئے کہ دونوں میں سے کونسا ملک ان سے بہتر ہمسائیگی رکھتا ہے اور نہ اس سے آنکھیں بند کرنی چاہئیں کہ وہاں کے ریاستی عوام کی فلاح و بہبود کا تقاضا کیا ہے۔

برطانوی حکومت کے اس اعلان آزادی کی عملی تشکیل ۱۴ر اگست کو تکمیل پا رہی تھی۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ جولائی کے مہینے میں ہی کانگریسی لیڈروں نے سرینگر کے چکر لگانے شروع کر دیئے اور مہاراجہ کشمیر کو شیشے میں اتارنے کے لئے نہ صرف صدر کانگرس اچاریہ کرپلانی بلکہ مہاتما گاندھی تک نے سرینگر کا سفر ضروری سمجھا۔ ان دنوں کانگرس سے مہاراجہ کشمیر اور اس کے وزیر اعظم رام چند کاک کے تعلقات ناخوشگوار سے تھے۔ اس لئے گاندھی جی جیسے ہاتھ گئے تھے ویسے ہی بے نیل و مرام واپس لوٹے۔ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی اسی فیصد سے زیادہ تھی۔ یعنی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق چالیس لاکھ کی کل ریاستی آبادی میں مسلمان بتیس لاکھ سے زیادہ تھے اور آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس جو ریاست میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت تھی بڑے زور و شور سے ریاست کے پاکستان سے الحاق کا مطالبہ کر رہی تھی۔ چنانچہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء ہی کو ہی جبکہ پاکستان کا وجود عمل میں آیا، مہاراجہ کشمیر کی ایک درخواست پاکستان سے معاہدہ جاریہ کے سلسلے میں موصول ہوئی اور اگلے ہی دن حکومت

پاکستان نے اس کی منظوری عطا کر دی۔ گویا اس معاہدہ جاریہ (STAND STILL AGREEMENT) کی وساطت سے مہاراجہ کشمیر نے اپنے عوام کی منشا اور جغرافیائی رشتے کے عین مطابق ریاست کی قسمت کو پاکستان سے وابستہ کر دیا۔

ظلم و تشدد کا راستہ چند ہی روز گذرے تھے کہ ریڈکلف ایوارڈ کے ذریعے حد بندی کا آخری اعلان ہوا۔ یہی وہ اعلان تھا جو برطانوی سلطنت کی بے انصافی اور شیطنت کا بدترین شاہکار بن کر ہمیشہ تاریخ میں محفوظ رہے گا۔ یہی ایوارڈ تھا جس کے ذریعے تقسیم ہند کے سلسلے میں تاریخ کی سب سے گھناؤنی سازش تکمیل کو پہنچی اور ضلع گورداسپور جو پاکستان میں شامل تھا، تحصیل شکرگڑھ کے سوا، پورے کا پورا پاکستان سے کاٹ کر بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ اور اس بددیانتی کے زور پر ریاست جموں و کشمیر کے ڈانڈے پٹھانکوٹ اور دہلی سے ملا دیئے گئے۔ ادھر یہ ہوا اور اُدھر مہاراجہ کشمیر پر یہ دباؤ ڈالا جانے لگا کہ اب بھارت سے ریاست کا راستہ صاف ہے اس لئے پاکستان سے معاہدہ ختم کر کے اپنا رشتہ بھارت سے استوار کرو۔ یہ ہوا اور ساتھ ہی ریاست میں نئی نئی تبدیلیاں ظہور پانے لگیں۔ کانگرس، وزیر اعظم رام چندر کاک کے خلاف تھی۔ اسے فوراً الگ کر دیا گیا اور ایک اکھڑ اور درشت مزاج ڈوگرہ فوجی میجر جنرل جنک سنگھ عارضی طور پر ریاست کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ راشٹریہ سیوک سنگھ کے رضاکار اور سکھ ہزاروں کی تعداد میں فوج در فوج ریاست میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریاست کے طول و عرض میں ظلم اور دہشت کی آگ بھڑک اٹھی اور چپے چپے پر کشمیر کے بہاستان بے گناہ مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بننے لگے۔ ریاست کی ڈوگرہ فوج اس سارے قتل عام کی سرپرستی کر رہی تھی اور اس ظلم و تشدد کا سب سے زیادہ زور پونچھ کے علاقے میں تھا جہاں وہ بہادر اور جنگجو مسلم قبائل آباد تھے جو دو عالمگیر جنگوں میں انگریزی فوج میں شامل ہو کر داد شجاعت دے چکے تھے۔ اسی علاقہ میں سب سے پہلے مہاراجہ کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا۔ اور ان مجاہدین صف شکن نے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو باغ کے علاقہ سے آزاد جہاد کر کے دو ہی دن بعد آزاد کشمیر گورنمنٹ کے قیام کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ سردار محمد ابراہیم خاں اس حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے اور اس حکومت نے پورے علاقہ کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہی دنوں مہر چند مہاجن، میجر جنرل جنگ سنگھ کی بجائے کشمیر کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھال چکے تھے۔

بھارت سے ناروا گٹھ جوڑ مجاہدین کی طرف سے یہ آغاز جنگ اس جوش و خروش اور فاتحانہ انداز سے ہوا کہ ڈوگرہ فوج کے بزدل سپاہی جگہ بجگہ راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی ہوائی جہاز میں جموں کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر اسی روز بذریعہ تار لارڈ مونٹ بیٹن کی

حکومت سے فوجی امداد طلب کی۔ اگلی صبح بھارتی حکومت کے ایک سکریٹری مسٹر وی۔ پی۔ مینن ہوائی جہاز سے جموں پہنچے۔ اور اُسی شام مہاراجہ سے الحاق نامہ پر دستخط حاصل کر کے واپس دہلی پہنچ گئے۔ بھارت سے ریاست کے الحاق کی یہ پر فریب کارروائی ۲۶ اکتوبر کو تکمیل پذیر ہوئی اور اُسی روز بھارت کی فوجیں ہوائی ذرائع سے کشمیر میں اُترنی شروع ہو گئیں۔ ان فوجوں کے وہاں پہنچنے سے قتل و غارتگری کا جو نیا بازار گرم ہوا اس نے پاکستان کے عوام، آزاد قبائل اور مسلمانوں کی ملحقہ ریاستوں کو بھی آتش زیر پا کر دیا۔ ہزاروں مجاہد رائفلیں تھامے کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کو پہنچنے لگے۔ ایک طرف بھارتی فوج مہاراجہ کے ڈوگرے سورما اور سیوا سنگھی عناصر تھے اور دوسری طرف ریاست اور ملحقہ علاقوں کے مسلمان مجاہد۔ اس طرح جموں و کشمیر کی وادیوں اور پہاڑوں میں ایک ایسی ہمہ گیر جنگ کا آغاز ہو گیا جو اس پوری جنت ارضی پر آگ بن کر چھا گئی۔

بھارت سلامتی کونسل کے حضور میں

پنڈت نہرو اور ان کی حکومت نے یہ سمجھا تھا کہ الحاق نامہ پر مہاراجہ کے دستخطوں کے بعد بھارت بڑی آسانی سے کشمیر کے لالہ زاروں پر تسلط جمانے کے قابل ہو جائے گا۔ لیکن اب انہوں نے محسوس کیا کہ صورت حال کافی مختلف ہے۔ چنانچہ بھارتی حکومت نے مردانہ وار مجاہدین کا سامنا کرنے کی بجائے سلامتی کونسل کا رُخ کیا۔ اور یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو وہاں پاکستان کے خلاف اپنا یہ مقدمہ داخل کر دیا کہ وہ کشمیر میں ہنگامہ بپا کرنے کا مجرم ہے۔ سر ظفر اللہ خان نے سلامتی کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کی اور بھارت کے الزامات کی دھجیاں اڑاتے ہوئے خود بھارت پر یہ الزام عائد کیا کہ کشمیر کے الحاق کی کارروائی سراسر ناجائز اور غیر آئینی ہے۔ اور پاکستان اسے کسی صورت میں بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ بھارت اور پاکستان کے نمائندوں کی طویل بحث کے بعد سلامتی کونسل نے ۱۷ جنوری کو بلجیم کے نمائندے کی ایک قرارداد منظور کی جس میں ہر دو حکومتوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ صورت حال کو اعتدال پر لانے کے لئے فوری اقدامات عمل میں لائیں اور ہر ایسے بیان اور حرکت سے اجتناب کریں جو صورت حال کو ناخوشگوار بنانے کا باعث ہو۔ ہر دو حکومتوں سے اس قرارداد میں یہ بھی درخواست کی گئی کہ جب تک یہ مسئلہ سلامتی کونسل کے زیر غور ہے اس وقت تک ہر ایسے اقدام سے کونسل کو فوری طور پر مطلع کیا جائے جو صورت حال میں تغیر برپا کرنے کا باعث ہو۔

باہمی مذاکرات کی طے شدہ اساس

تین دن بعد، ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے یو۔ این۔ او کے ایک تین رکنی کمیشن کے تقرر کی قرارداد منظور کی جو موقع پر پہنچ کر صورت حال کا جائزہ لے اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ ۴ فروری کو سلامتی کونسل کے صدر کی طرف سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں فریقین سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ باہمی مذاکرات کے ذریعے کسی باعزت

سمجھوتے تک پہنچنے میں کوشاں ہوں۔ ان مذاکرات کے لئے قرارداد میں حسب ذیل اساسی نکات بھی طے کر دیئے گئے۔

۱۔ تمام ہنگاموں اور فسادات کو ختم کیا جائے۔

۲۔ بے ضابطہ فوجوں اور باہر سے آمدہ مسلح افراد کا اخراج عمل میں لایا جائے۔

۳۔ ایسی پرامن صورت حال معرض وجود میں آنے کے بعد باضابطہ مسلح فوجوں کا بھی اخراج عمل میں آئے۔

۴۔ ہنگامی صورت حال ختم ہونے پر ریاست کے مہاجر باشندوں کو اپنے گھروں میں واپس آنے کی دعوت دی جائے۔ انہیں ان کے شہری حقوق عطا کئے جائیں اور سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔

۵۔ آزادانہ اور خودمختارانہ رائے شماری کے لئے جس کے ذریعے عوام بھارت یا پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کر سکیں سازگار ماحول پیدا کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ سلامتی کونسل کی نگرانی میں عوام کو اظہار رائے کا یہ موقع جلد از جلد میسر آسکے۔

۳ر جون ۱۹۴۸ء کی ایک قرارداد میں سلامتی کونسل نے یو۔ این۔ کمیشن کو بلا تاخیر متنازعہ کشمیر میں پہنچنے اور صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ برائے کونسل مرتب کرنے کی ہدایت کی۔ کمیشن نے موقع پر پہنچ کر صورت حال کا جائزہ لیا اور ۱۳ر اگست ۱۹۴۸ء کو ایک قرارداد کی شکل میں اپنا نقطۂ نظر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا۔ یہ قرارداد حسب ذیل تین نکات پر مشتمل تھی۔

۱۔ دونوں حکومتیں ایک طے شدہ تاریخ کو جنگ بندی پر متفق ہو جائیں۔

۲۔ ریاست سے فوجی انخلا کا پروگرام زیر عمل لایا جائے۔

۳۔ کشمیر کا مستقبل ریاستی عوام کے حق خود ارادیت کی بنا پر آزادانہ رائے شماری سے طے کیا جائے۔

بھارت اور پاکستان نے ۲۳ر دسمبر اور ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو یکے بعد دیگرے باہمی صلحنامہ کے ان ہر سہ بنیادی نکات کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا۔ اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی شب کو بیک وقت جنگ کی آگ سرد پڑ گئی۔

جنگ بندی کا یہ فیصلہ تکمیل پا جانے کے بعد یو۔ این کمیشن نے ۵ر جنوری ۱۹۴۹ء کے اجلاس میں ایک قرارداد

منظور کی جو اُن ارتقائی مراحل پر مشتمل تھی جو جنگ بندی کے بعد رائے شماری کی منزل تک خوش اسلوبی سے پہنچنے کے لئے ضروری اور لابدی سمجھے گئے تھے۔ یہی وہ اہم اور تاریخی قرارداد ہے جس کی دیانتدارانہ تعمیل سے ریاست کا خوشگوار مستقبل وابستہ تھا اور اسی سے بھارت اور پاکستان کے مابین وہ بنائے فساد ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتی تھی جس نے آج ایک عالمگیر جنگ کے اندیشہ ہائے دور و دراز برپا کر رکھے ہیں۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس تاریخی قرارداد کا ملخص یہاں پیش کر دیں تاکہ قارئین یہ اندازہ لگانے کے قابل ہو سکیں کہ پاکستان نے اس قرارداد پر کس دیانتداری سے عمل کیا اور بھارت نے اس سے راہ فرار اختیار کرنے میں آج تک کس ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کا مظاہرہ جاری رکھا۔ اور سلامتی کونسل آج تک اُسے اس قرارداد پر عمل درآمد کرانے میں ناکام چلی آئی۔ قرارداد کے اہم نکات کا ملخص درج ذیل ہے۔

۱۔ کشمیر کے الحاق کا فیصلہ جمہوری طریق پر آزادانہ رائے شماری کے ذریعہ ہوگا

۲۔ جنگ بندی اور فوجی انخلاء کے مکمل ہونے پر کمیشن رائے شماری کے انتظامات عمل میں لائے گا اور سکریٹری جنرل کمیشن کے مشورے سے ناظم رائے شماری کا تقرر عمل میں لائیں گے۔

۳۔ ناظم رائے شماری کو حسب ضرورت اپنا عملہ اور مبصرین متعین کرنے کا کلی اختیار حاصل ہوگا

۴۔ پر امن صورت حال کے قیام کے بعد ناظم رائے شماری بھارتی فوجوں کے اس آخری انخلاء کا فیصلہ کرے گا جو مقبوضہ کشمیر میں غیر ضروری سمجھی جائیں گی۔ اور اسی قدر فوج باقی رکھی جائے گی جو بھارتی حکومت سے مشورے کے بعد مقبوضہ علاقوں کی سلامتی اور آزادانہ رائے شماری کے انتظامات کے لئے ضروری سمجھی جائے گی۔

۵۔ بعینہٖ آزاد کشمیر میں بھی اسی قدر فوج باقی رکھی جائے گی جو آزاد کشمیر گورنمنٹ سے مشورے کے بعد وہاں ضروری سمجھی جائے گی۔

۶۔ ریاست کے جو شہری فسادات کی وجہ سے ہجرت کر گئے ہیں، انہیں واپس آنے کی دعوت دی جائے گی اور انہیں پوری آزادی سے اپنے شہری حقوق بروئے کار لانے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

۷۔ ریاستی باشندوں کے علاوہ باہر کے وہ تمام لوگ جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد غیر قانونی طور پر ریاست میں داخل ہوئے ریاست سے رخصت

ہو جائیں گے۔

۸۔ رائے شماری کے معاملے میں رائے دہندگان پر کسی دباؤ، جبر و تشدد، خوف و ہراس یا دیگر نامناسب اثرات کا استعمال ممکن نہیں ہوگا۔

۹۔ جائز سیاسی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اظہار خیال اور ریاست کے الحاق کے سلسلے میں اظہار رائے دہی کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ پریس، تقریروں، اجتماعات اور سفر پر کوئی قدغن نہیں ہوگا۔

۱۰۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔ اقلیتوں کو پورا تحفظ حاصل ہوگا۔

۱۱۔ استصواب رائے کی تکمیل عمل میں آنے پر ناظم رائے شماری اس کی رپورٹ یو۔ این۔ کمیشن کو دے گا جس کی تصدیق پر اسے سلامتی کونسل میں پیش کر دیا جائے گا جو اس کا باضابطہ اعلان کریگی۔

مصالحانہ کوششوں کا انجام

یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو ریاست میں جنگ بند ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد پورا سال گذر گیا اور بھارت کو فوجی انخلا کی شرائط پر رضامند نہ کیا جا سکا۔ اس دوران میں یو۔ این۔ او کے مبصرین بھی جنگ بندی لائن پر پہنچ گئے اور پھر سلامتی کونسل نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ امیرالبحر نمٹز جو ناظم رائے شماری مقرر ہو چکے تھے متنازعہ امور کا فیصلہ کر دیں لیکن بھارت اس قسم کی کوئی تجویز قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ اس مقصد کے لئے سلامتی کونسل کے صدر جنرل میگناٹن بھی ۱۹۵۰ء کے آغاز میں تشریف لائے اور ناکام واپس گئے۔ ۱۴ مارچ ۱۹۵۰ء کو سر اوون ڈکسن کو اسی مقصد کے لئے کراچی اور دہلی کے دورے پر بھیجا گیا اور اس نے اپنی رپورٹ میں جو تجاویز پیش کیں بھارت ان سے بھی روگرداں رہا۔ ۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو ڈاکٹر گراہم آخری بار یو۔ این۔ او کے نمائندہ بن کر آئے لیکن بھارت کو معقولیت کی راہ پر لانے میں ان کی شبانہ روز جدوجہد بھی مایوس کن ثابت ہوئی۔ او ۲۷ مارچ ۱۹۵۳ء کو ان کی آخری رپورٹ کو بھی پنڈت نہرو کی ضد اور ہٹ دھرمی کا شکار رہنا پڑا۔

یہ ہے بھارت کا سلامتی کونسل کے معاملہ میں ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کا رسوائے عالم کردار جسکی مذمت میں عالمی پریس برابر ہم نوا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کے باوجود ہو رہا تھا کہ اس مسئلہ کو سلامتی کونسل میں خود بھارت نے پیش کیا تھا۔ لیکن جب یہ فیصلہ منظر عام پر آیا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ پنڈت نہرو اور ان کی مسلح فوجیں نہیں بلکہ کشمیر کے عوام کریں گے تو بھارتی سامراج نے عدل و انصاف کے تقاضوں کے خلاف وہ ڈھٹائی اختیار کی جس کی مثال تاریخ میں موجود نہیں۔

ڈھٹائی کا منافقانہ پہلو ہم چاہتے ہیں کہ یہاں چند لمحے رک جائیں اور سلامتی کونسل کے اس سلسلۂ مقامت سے ہٹ کر بھارت کے ذمہ دار لیڈروں اور بالخصوص پنڈت نہرو کی اس منافقانہ روش کا جائزہ لیں جو باقی دنیا اور خود پاکستان کو مبتلائے فریب رکھنے کے لئے وہ اپنے بیانات اور مراسلت میں اختیار کئے ہوئے تھے۔ یہی ہے وہ بدترین منافقت جس کی مثال بھارت کے سوا دنیا کے کسی گوشے اور تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملے گی۔ مسئلہ کشمیر کے پس منظر میں سب سے پہلے وائسرائے ہند لارڈ مونٹ بیٹن کا وہ خط ہمارے سامنے آتا ہے جو مہاراجہ کشمیر کے ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے خط کے جواب میں لکھا گیا۔ اور جس میں مہاراجہ کی بھارت سے الحاق اور فوجی امداد کی درخواست منظور کرتے ہوئے مہاراجہ پر یہ واضح کیا گیا تھا کہ

> جونہی کشمیر میں امن و امان بحال ہو گیا اور کشمیر کی سرزمین کو حملہ آوروں سے نجات مل گئی، ریاست کے الحاق کا قطعی فیصلہ ریاستی عوام کی منشا سے طے پائے گا۔

شاید بھارتی وزیر اعظم نے اس وضاحت کو کافی خیال کیا۔ اس لئے انہوں نے اگلے ہی روز برطانوی وزیر اعظم مسٹر اٹیلی کے نام ایک تار میں انہیں یہ یقین دلایا کہ

> میں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ ہنگامی صورت حال میں ریاست کو امداد بہم پہنچانے کا یہ مقصد قطعاً نہیں کہ ریاست پر تسلط جمانے کے لئے اپنا اثر قائم کیا جائے۔ ہم اس سلسلے میں اپنے جس نقطہ نظر کی بار بار وضاحت کر چکے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی متنازعہ علاقہ یا ریاست کے کسی ایک ملک سے الحاق کا فیصلہ وہاں کے عوام کی خواہشات کے مطابق طے پانا چاہیئے۔ ہم اس مؤقف پر سختی سے قائم ہیں۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو (یعنی اس سے دوسرے روز) وزیر اعظم نہرو نے پاکستان کے وزیر اعظم مرحوم لیاقت علی خاں کو بھی ایک تار میں یہی یقین دلایا۔ ۳۱ اکتوبر کو پنڈت نہرو نے لیاقت علی خاں مرحوم کے نام ایک اور تار ارسال کیا۔ اس تار میں یہ مزید کہا گیا تھا کہ

> بھارت سے کشمیر کا الحاق مہاراجہ کی درخواست پر قبول کیا گیا تھا۔ اور اس وقت بھی یہ اس شرط پر قبول کیا گیا تھا کہ جونہی حملہ آوروں کو کشمیر سے نکال دیا گیا اور امن و امان بحال ہو گیا۔ الحاق کا مسئلہ خود کشمیری عوام طے کریں گے اور انہیں اس کا پورا حق حاصل ہو گا۔ کہ وہ جس مملکت سے چاہیں الحاق کر لیں۔

ہماری یہ یقین دہانی کہ امن قائم ہوتے ہی ہم اپنی فوجیں ریاست سے نکال لیں گے اور کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام پر چھوڑ دیں گے یہ آپ ہی کی حکومت کے ساتھ ایک اقرار صالح نہیں بلکہ یہ اقرار کشمیری عوام اور پوری دنیا کے ساتھ ہے۔

مہاتما گاندھی نے بھی ایک اعلان میں اس موقف کا اعادہ کیا اور پھر ایک قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) میں بھی بھارتی حکومت نے اس یقین دہانی کی توثیق کی۔

۱۵ر جنوری ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل میں تنازعہ کشمیر پر بھارتی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے نمایندے نے اپنی تقریر میں کہا کہ

کشمیر بھارت سے علیحدگی اختیار کرلے۔ اس سے اپنا الحاق قائم رکھے یا آزاد آنہ حیثیت سے مجلس اقوام متحدہ میں شمولیت اختیار کرلے، ہم اس موقف کی توثیق کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ طے کرنے کا اختیار کشمیری عوام کو ہوگا۔ ہم وہاں صرف امن و امان کی بحالی چاہتے ہیں۔

۲ر نومبر ۱۹۴۷ء کے ایک نشریہ میں بھارت کے وزیر اعظم نے یہ اعلان کیا کہ

ہم اعلان کر چکے ہیں کہ ریاست کشمیر کا قطعی اور آخری فیصلہ وہاں کے عوام طے کریں گے۔ مہاراجہ نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ ہم کشمیری عوام کو ہی نہیں پوری دنیا کو اس کا یقین دلا رہے ہیں۔ ہم نہ تو اس سے انحراف اختیار کریں گے اور نہ ہمارے لئے ایسا کرنا ممکن ہے۔ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ جونہی ریاست میں امن بحال ہو وہاں یو۔ این۔ او جیسے ادارے کی نگرانی میں رائے شماری عمل میں لائی جائے۔

اگلے روز وزیر اعظم پاکستان کے نام ایک تار میں پنڈت نہرو نے اپنے اس نشریہ کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں مزید یقین دلایا کہ

میں نے (اس نشریہ میں) اپنی حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ہم کشمیر پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بلکہ آخری فیصلہ وہاں کے عوام پر چھوڑتے ہیں۔

۲۱ر نومبر کو پنڈت نہرو نے ایک بار پھر اس یقین دہانی کا اعادہ ایک سرکاری اعلان میں کیا۔ ۱۹۵۱ء کے ہم بہار میں

بھارت کے نائب وزیر اعظم (اور وزیر تعلیمات) مولانا ابوالکلام آزاد ایران گئے تو وہاں ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے اپنی حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ

> بھارتی حکومت بارہا اپنے اس مؤقف کا اعلان کر چکی ہے کہ وہ کشمیری عوام کی خواہشات کا احترام کرتی ہے...... ہم ہمیشہ سے یہ کہتے چلے آئے ہیں اور آج بھی اس پر قائم ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا کشمیر کے عوام کا کام ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ شمولیت کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ۔

اب سنیے بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو کا وہ اعلان جو انہوں نے ۷ اگست ۱۹۵۲ء کو بھارتی پارلیمنٹ میں کیا۔ ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے! ارشاد ہوتا ہے—

> "........ ان تمام حوالہ جات کی روشنی میں میں یہ اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ کشمیر کا قطعی فیصلہ وہاں کے عوام کے دل و دماغ سے تکمیل پائے گا...... اس ایوان کی منشا اور آرزوؤں کو اس معاملہ میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ نہ صرف اس لئے کہ اس ایوان کو ایسا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ایسا فیصلہ خود اس اصول کے منافی ہوگا جس کا یہ پارلیمنٹ دعویٰ کرتی ہے۔
>
> کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے کسی علاقہ کا مسئلہ نہیں۔ کشمیر سے ہمارا ذہنی و قلبی رشتہ ہے اگر کشمیری عوام ہمارے ساتھ وابستگی پسند نہیں کرتے تو انہیں اس کی کھلی آزادی ہونی چاہیئے۔ ہم انہیں ان کی منشار کے خلاف اپنے ساتھ وابستہ نہیں رکھیں گے خواہ ہمیں اس سے کتنا ہی دکھ کیوں نہ محسوس ہو۔ ہندوستان اس مؤقف پر قائم رہے گا...... ہم کشمیر کے عوام کو ان کی منشا کے خلاف فوجی بل بوتے پر اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ ہم سے اپنے تعلقات ختم کرنا چاہتے ہیں تو وہ یہ راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہیں۔

وزیر اعظم نہرو کے اس اعلان کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے۔ یوں نظر آتا ہے کہ انسانی آزادی، جمہوریت، حق خود ارادیت اور احترام آدمیت کا اس سے بڑا حامی اور سرپرست ساری دنیا میں نہیں ملے گا۔ لیکن اس دوغلے پن اور منافقت کو کیا کہا جائے کہ کشمیری عوام، پاکستان اور عالمی رائے عامہ کو متاثر اور مسحور کرنے کے لئے بڑی شد و مد سے یہ اعلانات کئے جا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف کشمیر سے فوجی انخلاء کے بارے میں سلامتی کونسل اور یو۔ این۔ کمیشن کے ہر فیصلے، ہر رائے، ہر مشورے اور ہر مخلصانہ سعی و کاوش کو پوری ڈھٹائی سے مسترد اور ناکام بنایا جا رہا ہے۔

اور یہ منافقت اور دورخی ۹ اگست ۱۹۵۳ء تک (جبکہ وزیر اعظم محمد علی بوگرا سے مذاکرات دہلی کے بعد مشترکہ اعلان جاری ہوتا ہے) برابر جاری رہتی ہے۔ اس مشترکہ اعلان میں بھی کشمیری عوام کی منشا اور رائے شماری کو اس مسئلہ کا واحد حل تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو اچانک دنیا نے یہ خبر وحشت اثر سنی کہ کشمیر کے وزیر اعظم اور پنڈت نہرو کے عزیز ترین دوست شیخ محمد عبداللہ وزارت عظمیٰ سے برطرف کر کے جیل میں ڈال دیئے گئے۔ اور درمیان میں ایک مختصر سے وقفے کی رہائی کے علاوہ) وہ گیارہ سال اپنے رفقاء سمیت قید و بند کی صعوبتوں کا شکار رکھے گئے۔ اور اب پھر سرکاری مہمان کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔

تمام معاہدوں سے کھلا فرار

یہی مرحلہ تھا جبکہ بھارت کی پالیسی میں یکایک ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری پر ریاست میں جو آگ بھڑکی اُسے ٹھنڈا کرنے کے لئے وزیر اعظم محمد علی بوگرا کو دہلی بلایا گیا اور مشترکہ اعلان کے لئے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے عوام کو مطمئن اور ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جونہی یہ جوش و خروش ٹھنڈا پڑا، بھارتی وزیر اعظم نے علی الاعلان سالہا سال کی مسلسل یقین دہانیوں پر پانی پھیر دیا اور یہ نیا نعرہ ایجاد کیا کہ کشمیر کے عوام اپنی اسمبلی کی وساطت سے الحاق کے فیصلے کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اس لئے اب کشمیر بھارت کا حصہ ہے اور وہ اس بارے میں کسی فیصلے اور قرارداد کا پابند نہیں۔ ۱۹۵۳ء سے یہ نعرہ اب برابر بھارتی نیتاؤں کی زبانوں پر ہے۔ صدر راجندر پرشاد ہوں یا ہنگامہ باز مینن ہوں، لال بہادر شاستری ہوں یا سورن سنگھ اور رادھا کرشنن ہوں۔ مسٹر چھاگلہ ہوں یا ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ۱۹۵۳ء سے سب اس نعرے کو اس ڈھٹائی سے بلند کئے چلے آرہے ہیں کہ پوری عالمی رائے عامہ اور عالمی پریس اس ڈھٹائی اور بے حیائی کا مضحکہ اڑا رہا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ محسوس کرنے کو تیار نہیں کہ جمہوریت اور سیکولرازم کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ ساتھ اس سامراجی ضد اور ڈھٹائی نے انہیں کس طرح ذلیل اور رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔ اور دنیا کا کوئی ملک اس ڈھٹائی میں ان کا ہم نوا یا مؤید نہیں۔

ملزم بھی اور جج بھی

اگست ۱۹۵۳ء کی نئی دہلی کی نہرو بوگرا ملاقات کے بعد ۱۹۵۵ء کے آغاز تک مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں کوئی اہم قدم نہیں اٹھ سکا۔ مذکورہ ملاقات سے پنڈت نہرو کا مقصد اس تند و تیز صورتِ حال سے جان چھڑانا تھا جس کے شعلے شیخ محمد عبداللہ کی ۹ اگست کی گرفتاری پر پوری ریاست میں بھڑک اٹھے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ ساڑھے چار سال تک جیل میں پڑے رہے اور ان کے جانشین بخشی غلام محمد کی قیادت میں یہ کوششیں شروع ہو گئیں کہ ریاست کی نام نہاد آئین ساز اسمبلی کی وساطت سے کشمیر کے بھارت سے الحاق پر مہر تصدیق ثبت کر دی جائے۔ لندن ٹائمز

کی رپورٹ کے مطابق ریاست میں ایک لاکھ بھارتی فوج متعین کی جا چکی تھی۔ عوامی رہنما جیلوں میں پڑے تھے۔ خوف و ہراس کی یہ کیفیت پیدا کر کے سنگینوں کے سائے میں اسمبلی کے انتخابات عمل میں لائے گئے اور جی حضوریوں کی اس نام نہاد سبھا کے ذریعے الحاق کی توثیق حاصل کر لی گئی۔ ریاست کی تمام نمائندہ جماعتوں نے (جن میں کشمیر ڈیموکریٹک یونین، کشمیر کسان مزدور کانفرنس، محاذ رائے شماری اور "کشمیر کا جھگڑا ختم کرو" کمیٹی شامل تھیں۔ اس ڈھونگ کا بائیکاٹ کیا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز، لکھن پال اور چوٹی کے جمہوریت پسند دیگر لیڈروں نے کھلم کھلا اخباری بیانات اور پمفلٹوں میں اس اسمبلی اور اس کے فیصلے کو بدترین فراڈ قرار دیا۔ اس کے باوجود، ہندو لیڈر اس ڈھٹائی پر تلے رہے اور پھر بھارت کی اسمبلی نے بھی اس کی منظوری عطا کر دی اور اس کے فیصلے کے مطابق ۲۵ جنوری ۱۹۵۷ء کی تاریخ ریاست کو باضابطہ طور پر بھارت میں مدغم کرنے کے لئے مقرر کر دی گئی۔ یہ سب کچھ طے کرنے کے بعد بھارت کے عیار اور مکار لیڈروں نے یہ سمجھ لیا کہ کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو گیا۔

پاکستان سلامتی کونسل میں

بھارتی لیڈر یہ ڈھونگ رچا کر مطمئن ہو گئے کہ میدان مار لیا۔ عین اسی وقت بین الاقوامی سیاسیات میں ایک بم پھٹا اور پورے زور کا دھماکہ ہوا۔ یہ سیاسی بم شیخ محمد عبداللہ کا وہ تاریخی خط تھا جو ایک روز جنوری کے آغاز میں ہی جیل سے سلامتی کونسل کی میز پر پہنچ گیا۔ اس خط میں شیخ صاحب نے بھارت کے ڈھونگ کا پول کھول دیا اور اس کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ پاکستان کی وزارت عظمیٰ کی مسند پر اس وقت حسین شہید سہروردی فائز تھے۔ انہوں نے وزیر خارجہ ملک فیروز خاں نون کو مناسب ہدایات کے ساتھ یو۔ این۔ او میں بھیج دیا۔ جہاں پہنچ کر انہوں نے ۱۷ جنوری کو بھارت کے اس نئے ہتھکنڈے کی تفصیل سلامتی کونسل میں پیش کر دی۔ ۱۹ جنوری کو سلامتی کونسل کا اجلاس وزیر خارجہ پاکستان کی تقریر سے شروع ہوا۔ اور انہوں نے کونسل پر واضح کیا کہ بھارت سلامتی کونسل کے طے شدہ فیصلوں سے کھلا انحراف کر کے کشمیر میں ایسے اقدامات عمل میں لا رہا ہے جنہیں کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جائے گا۔

۲۳ جنوری کو بھارت کے وزیر دفاع مسٹر کرشنا مینن نے سلامتی کونسل میں بھارت کی نمائندگی کرتے ہوئے کونسل کی طے شدہ قراردادوں کی پابندی اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور بھارت کے تازہ ڈھونگ کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ کشمیر کے بھارت سے الحاق کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر مینن کی تقریر کا سلسلہ ابھی آئندہ دنوں کے لئے جاری تھا کہ ۲۵ جنوری کو سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی۔ یہ قرارداد بھارت کے منہ پر ایک زوردار طمانچے سے کم نہیں تھی۔ اپنی سابقہ قراردادوں کا اعادہ کرتے ہوئے

کونسل نے اس تازہ قرارداد میں واضح کیا کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ ریاستی عوام کی مرضی سے ہوگا اور عوام کی مرضی اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کے ذریعے معلوم کی جائے گی۔ سلامتی کونسل کی قرارداد میں بھارت کو اس حقیقت کا بھی احساس دلایا گیا تھا کہ کشمیر کی نام نہاد دستور ساز اسمبلی کا کوئی فیصلہ ریاست کے مستقبل پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ سلامتی کونسل کا یہ فیصلہ خود سٹیٹسمین (دہلی) کے نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق پاکستان کی فتح اور بھارت کی کھلی شکست کا آئینہ دار تھا۔ نامہ نگار نے لکھا تھا۔

بھارت کی اخلاقی شکست

> پاکستان پہلے راؤنڈ میں جیت گیا۔ کونسل کا یہ فیصلہ پاکستان کی واضح فتح اور اس امر کا ثبوت ہے کہ کشمیر کے متعلق عالمی رائے عامہ مستحکم طور پر بھارت کے خلاف ہے۔

ٹائمز آف انڈیا کے نامہ نگار (مقیم لندن) نے لکھا۔

> ایک اور بات بھی دیکھنے میں آئی ہے اور وہ یہ کہ بھارت کی موجودہ پریشانیوں پر اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے اور دنیا یہ دیکھ کر خوش ہو رہی ہے کہ بھارت پر آڑا وقت آ گیا ہے۔

یہ فیصلہ مغرور پنڈت نہرو کی پکی پکائی کھیر کو دلیا بنانے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ اس نے اسی روز اس فیصلے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنے اخباری بیان میں کہا کہ

> سلامتی کونسل کی قرارداد پر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔ کونسل کے ارکان نے بھارت کا پورا بیان سننے سے پہلے ہی قرارداد منظور کر لی۔ یہ معاملہ اس قدر سنگین ہے کہ اس پر روا روی میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے۔ مجھے اس کے سوا کچھ نہیں کہنا کہ معاملہ جوں کا توں ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

بھارت نے سلامتی کونسل کے اس فیصلے سے اپنا انحراف جاری رکھا۔ اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو جب سلامتی کونسل کا فیصلہ مذکورہ قرارداد کی صورت میں دنیا کے سامنے آ رہا تھا، بھارت کشمیر کے بھارت میں ادغام کا اعلان کر رہا تھا۔ اسی روز کشمیر کے بھارت میں الحاق کے اقدام پر پاکستان میں یوم مذمت منایا گیا۔ ہر بڑے شہر میں تاریخی جلوس نکلے اور ہمہ گیر ہڑتال عمل میں آئی۔ اسی سلسلے میں مظاہرین کا جو جلوس کراچی میں نکلا اُسے ایوان صدر کے دروازوں پر خود صدر اسکندر مرزا نے خطاب کیا اور کہا۔

سلامتی کونسل کی قرارداد نے اہل کشمیر کو بھارت کی مکروہ سازش سے، جس کا مقصد انہیں ہمیشہ کے لئے غلام بنانا تھا، محفوظ کر دیا ہے۔ یہ قرارداد بین الاقوامی معقولیت اور اخلاقی انصاف کی آئینہ دار ہے اور اس نے پاکستان کے مؤقف کو حق بجانب ثابت کر دیا ہے ..... حالات کا یہ رُخ کشمیری عوام کے لئے طویل تعطل کی کالی گھٹاؤں میں روشنی کی ایک کرن کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس قرارداد کے بعد ۲۰ فروری ۱۹۵۱ء کو سلامتی کونسل کے صدر مسٹر جارنگ کو صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے بھارت اور پاکستان بھیجا گیا۔ لیکن انہوں نے بھی سلامتی کونسل میں اپنی رپورٹ میں جو تجاویز پیش کیں بھارت نے انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بھارت کا اب دعویٰ یہ تھا کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے اور اس کا داخلی مسئلہ جس میں کوئی مداخلت گوارا نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ مسٹر جارنگ کی ناکامی کے بعد جب مسٹر فرینک گراہم آخری بار ۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کو دورے پر بھیجے گئے تو ان کی کوششوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ انہوں نے ہر دو ملکوں کے وزرائے اعظم کی ملاقات کی تجویز بھی پیش کی لیکن بھارت کی ضد اور ہٹ دھرمی نے ہر معقول تجویز پر پانی پھیر دیا۔ ڈاکٹر گراہم نے اپنی رپورٹ مارچ ۱۹۵۸ء میں مکمل کی اور چار سال بعد اپریل ۱۹۶۲ء میں کونسل کے سامنے زیر غور لائی گئی۔

اس دوران میں صدر محمد ایوب خان اور پنڈت نہرو کے درمیان مسئلہ کشمیر کو سلجھانے کی کوششیں سرے سے کارآمد رہیں۔

صدر ایوب کے برسر اقتدار آنے پر

مسئلہ کشمیر ایک نئے مرحلے میں

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خاں نے پاکستان کی عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی۔ اسی روز انہوں نے قوم کے نام اپنے نشریہ میں بھارت سے متعلق یہ اعلان کیا کہ—

ہم بھارت سے الجھنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ یہ جنگ پاکستان اور بھارت دونوں کی تباہی کا باعث ہوگی۔ بنا بریں میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ پُرامن اور باعزت مفاہمت کے لئے ہمارے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو مشرقی پاکستان جاتے ہوئے صدر ایوب نے دہلی کے ہوائی اڈہ پر پنڈت نہرو سے پہلی ملاقات کی اور بھارتی وزیر اعظم پر مسئلہ کشمیر کے جلد از جلد تصفیہ پر زور دیا جس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تعلقات بگڑتے چلے آرہے تھے۔ اور دونوں ملکوں کی توانائیاں اس تنازع میں ضائع ہو رہی تھیں۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں بھارتی وزیر اعظم سرکاری مہمان کی حیثیت سے نہری پانی کے معاہدہ پر دستخط کرنے پاکستان آئے تو ۲۳ ستمبر کے مشترکہ اعلامیہ میں مسئلہ کشمیر کے حل کرنے پر پورا اتفاق ظاہر کیا گیا۔ لیکن اس کے جلد ہی بعد جب وہ امریکہ گئے تو واشنگٹن کی ایک پریس کانفرنس میں پھر پرانی منافقت کا اعادہ کیا اور ایک اخباری نمائندہ کے سوال کے جواب میں کہا کہ :-

کشمیر کی موجودہ صورت حال میں اگر کوئی تبدیلی لانے کی کوشش کی گئی تو اس سے کئی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ہٹ دھرمی اور ضد کا یہ سلسلہ قائم تھا کہ چین سے لڑائی کا مرحلہ سامنے آ گیا۔ بھارت نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے پاکستان سے محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کر دیں اور ۳۰ نومبر ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی اور دہلی سے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا۔ جس میں اعلان کیا گیا کہ ہر دو ملکوں کے سربراہ اس پر متفق ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ اور ہر دو ملکوں کے دیگر باہمی تنازعات کو حل کرنے کے لئے از سر نو کوششوں کا آغاز ہونا چاہئے تاکہ پاکستان اور بھارت دونوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ امن اور دوستی کی فضا میں زندہ رہنے کے قابل ہو سکیں۔

چین کا ہوا

اس مشترکہ اعلامیہ کے بعد جو صدر محمد ایوب خاں اور وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے دستخطوں سے جاری ہوا، ہر دو ملکوں کے مابین مذاکرات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان مذاکرات میں پاکستان کی نمائندگی ذوالفقار علی خاں بھٹو کے حصے میں آئی اور سردار سورن سنگھ بھارتی وفد کی قیادت کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ۲۶ دسمبر ۱۹۶۲ء سے ۱۶ مئی ۱۹۶۳ء تک راولپنڈی، کلکتہ، کراچی اور دہلی میں متعدد اجلاس منعقد ہوئے جن میں مسئلہ کشمیر پوری تفصیل سے زیر بحث آیا۔ لیکن بھارت نے تو محض چین سے اپنی جنگ کے دوران پاکستان کو مبتلائے فریب رکھنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ اس لئے مذاکرات کے اس سلسلے کو جس قدر طول دینا ممکن تھا، دیا گیا اور جب چین کی دستبرد سے نجات مل گئی تو اپنی روایتی عیاری کو کام میں لا کر صلح جوئی کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ ۱۶ مئی ۱۹۶۳ء کو یہ سلسلہ مذاکرات انتہائی ناکامی سے اختتام پذیر ہو گیا اور مشترکہ اعلامیہ میں دنیا کو یہ بتا دیا گیا کہ

آج اس آخری ملاقات کے خاتمہ پر ہر دو وزراء بڑے افسوس سے یہ اعلان

کرتے ہیں کہ تنازعہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں ہوا۔

بھارت نے پاکستان کی امن پسندی کے پرخلوص جذبے کا پورا فائدہ اٹھایا اور چین کے ہاتھ سے نجات پانے کے بعد بڑی عیاری سے اور روایتی ہٹ دھرمی سے بھٹو، سورن سنگھ مذاکرات کو حسب ضرورت ناکام بنا دیا۔ اور عہد رفتہ کے تمام فیصلوں اور تحریری معاہدوں سے شرمناک انحراف اختیار کرتے ہوئے ریاست کے مکمل ادغام کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۲۷ نومبر ۱۹۶۳ء کو وزیراعظم نہرو نے بھارتی پارلیمنٹ میں یہ اہم اعلان کیا کہ

۱۔ ریاست کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کی جاتی ہے۔ اسے آئندہ بھارت کے ایک صوبے کی حیثیت حاصل ہو گی۔

۲۔ ریاست میں صدر ریاست اور وزیراعظم کے مناصب ختم کئے جاتے ہیں اور آئندہ ان عہدوں کو گورنر اور وزیر اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہو گی۔

۳۔ جموں اور کشمیر سے آئندہ براہ راست بھارت کی مرکزی اسمبلی کے لئے نمائندوں کا انتخاب ہو گا۔

وزیراعظم کے بعد وزیر داخلہ نے بھارتی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ کشمیر اب بھارت کا حصہ بن چکا ہے اور اس بارے میں آئندہ کسی سے کوئی گفتگو روا نہیں رکھی جائے گی۔

پارلیمنٹ میں یہ نیا اعلان کر کے بھارتی سامراج کے علمبردار اب ایک بار پھر مطمئن ہو گئے کہ انہوں نے بزعم خویش یہ سمجھ لیا کہ ریاست کو آئین و قانون کے نام پر یوں ہضم کر کے اس بین الاقوامی جھگڑے کی جڑ کاٹ دی۔ لیکن جب تک کشمیری عوام میں زندگی اور غیرت کی آخری رمق موجود ہے یہ احمقوں کی جنت کب تک برقرار رہ سکتی ہے۔ بھارت کے سامراجی اپنی اس خود فریبی اور خوش فہمی میں ابھی اطمینان کا پہلا سانس بھی نہیں لینے پائے تھے کہ ریاست کے طول و عرض میں غیرت ایمانی کا ایک نیا لاوا پھوٹ پڑا اور بھارتی سامراج اس کی زد میں بدترین خطرات سے دوچار ہو گیا۔ یہ قیامت حضرت بل کی خانقاہ معلیٰ سے حضور نبی اکرمؐ کے اس موئے مبارک کی اچانک گمشدگی سے برپا ہوئی جو صدیوں سے وہاں بطور تبرک محفوظ چلا آ رہا تھا۔ اور اسے حکومت کی ایک سازش اُسے غائب کرنے کا موجب ہوئی تھی۔

کشمیری عوام نے اس واقعہ کو اپنی غیرت ایمانی کے لئے کھلا چیلنج تصور کیا اور موئے مبارک کی بازیافت کا نعرہ بلند کرتے ہوئے وہ سروں پر کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے۔ پاکستان کے طول و عرض میں بھی اس واقعہ پر غیظ و غضب کے شعلے بھڑک اٹھے۔ کشمیری عوام کا خون ریاست کے بھارت میں ادغام کی سامراجی سازش پر

پہلے ہی کھول رہا تھا۔ موئے مبارک کی چوری نے اس جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور چاروں طرف اس جوشِ حریت کے شعلے آسمان تک بلند ہونے لگے۔ پاکستان کے لئے اس صورتِ حال میں خاموشی اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۶۴ء کو وزیر خارجہ پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے یہ سارا معاملہ سلامتی کونسل میں پیش کر دیا۔ اور اس پر غور و خوض کا مطالبہ کیا۔ ایک عرصہ کے بعد سلامتی کونسل میں پھر اس سالہا سال کے پرانے تنازعہ پر بحث شروع ہوئی۔ وزیر خارجہ پاکستان نے ایک بار پھر سلامتی کونسل کے احساسِ فرض کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ بھارت کی نمائندگی وہاں کے وزیر تعلیم مسٹر عبدالکریم چھاگلہ نے کی اور وہی مسٹر مینن کا پرانا راگ الاپا کہ کشمیر اب بھارت کا جزو لاینفک ہے اور بھارت اس بارے میں سلامتی کونسل کی کسی قرارداد کا پابند نہیں۔ کئی دن کی بحث و تمحیص بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ سلامتی کونسل کا مردہ ضمیر بدستور بے حس و حرکت رہا اور دونوں ملکوں سے باہمی گفت و شنید کا آغاز کرنے کی رسمی اپیل کر کے یہ اجلاس بھی اختتام پذیر ہو گیا۔ اور ساری دنیا پر ثابت ہو گیا کہ سلامتی کونسل پر مسلط سامراجی طاقتیں اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر چالیس لاکھ اہلِ کشمیر کو بدستور بھارتی سامراج کے چنگل میں گرفتار رکھنا چاہتی ہیں۔

پرعزم اور بلند ہمت بھٹو سلامتی کونسل کی بے حسی اور بے ضمیری کا مرثیہ پڑھتے واپس لوٹے اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ جس عالمی ادارے کے سپرد ہے اس سے اب عدل و انصاف کی کوئی توقع وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ حکومتِ پاکستان بھی اس صورتِ حال سے شدید متاثر تھی۔ اور کشمیری عوام پر بھی اس کا گہرا ردِ عمل ہوا۔ چاروں طرف مایوسی کا ایک سماں طاری تھا۔ اس دوران میں شیخ عبداللہ کی رہائی نے فضا میں کچھ ہنگامے بکھیرے۔ کشمیر کی فضا پھر "شیرِ کشمیر زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی۔ شیخ صاحب پاکستان بھی تشریف لائے۔ اور ابھی وہ پاکستان میں تھے کہ وزیر اعظم نہرو کے انتقال کی خبر پہنچی اور وہ اسی روز دہلی روانہ ہو گئے۔

پنڈت نہرو کے بعد وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان لال بہادر شاستری کے حصے میں آیا۔ انہوں نے دولتِ مشترکہ کے اجلاس میں پہلی بار پنڈت نہرو کے جانشین کی حیثیت سے شرکت کی۔ وہاں صدر پاکستان سے ان کی رسمی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ لیکن مسئلہ کشمیر کے بارے میں کسی مؤثر گفتگو کا آغاز ممکن نہ ہوا۔ شاستری جی، پنڈت نہرو سے بھی بڑھ چڑھ کر کشمیر کو بھارت کا "اٹوٹ انگ" سمجھے بیٹھے تھے اس لئے وہ اس مسئلے پر پاکستان سے کوئی گفت و شنید کرنے سے جان بچاتے رہے۔ انہوں نے بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اپنے پیش رو کی طرح یہ سمجھ لیا کہ کشمیر کی آگ اسی خاموشی سے آہستہ آہستہ سرد پڑ جائے گی اور کشمیری عوام کا جوش اور ولولے خاکستر میں تبدیل ہو جائیں گے۔

لیکن یہ آگ ایسی نہیں تھی جو سرد پڑ جائے اور خاکستر میں تبدیل ہو جائے۔ ۹ر اگست ۱۹۶۵ء کو یکایک ایک نئے ریڈیو اسٹیشن — صدائے کشمیر — کی نشریات پہلی بار فضا میں گونج اٹھیں۔ یہ کشمیری عوام کی نئی اور سب سے

منظم بغاوت کا اعلان تھا۔ اسی اعلان نے انقلابی کونسل کے قیام کا اعلان کیا۔ اور ۹ اگست کو ہی اس انقلابی کونسل کی قیادت میں ریاست کی بلندیوں اور پستیوں میں گوریلا جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اور آزادیٔ کشمیر کے علمبردار مجاہد چپے چپے پر بھارتی فوج کے درندوں کا صفایا کرنے لگے۔ بھارت نے اس آگ کو بزور کچلنے کے لئے آگے بڑھ کر ٹیٹوال کی اُن چوکیوں پر قبضہ کر لیا جو آزاد کشمیر سے متعلق تھیں اور ساتھ ہی گجرات کے ایک گاؤں اعوان شریف پر بمباری کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکم ستمبر کو پاکستان کی فوجیں بھی حرکت میں آگئیں اور انہوں نے بھارت کو مذکورہ خلاف ورزیوں پر مزا چکھانے کا فیصلہ کیا۔ بھارت کے بزدل فوجی جو نہتے کشمیریوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنا سیکھے تھے، بھیڑ بکریوں کی طرح ہر محاذ سے راہِ فرار اختیار کرنے لگے اور پانچ دنوں میں پاکستان کی فوجیں بھارتی سورماؤں کا تیا پانچہ کرتی چھمب اور جوڑیاں تک کے اہم بھارتی فوجی ٹھکانوں پر تسلط جمانے میں کامیاب ہو گئیں۔ پاکستان کی یہ یلغار بڑی تیزی سے فتح و نصرت کے جلو میں آگے بڑھ رہی تھی کہ ۶ ستمبر کی صبح کو بھارت نے بلا اعلانِ جنگ لاہور سیکٹر پر حملہ کیا اور بین الاقوامی سرحدوں کو توڑ کر ایک نئی جنگ کا آغاز کر دیا جو ۲۳ ستمبر کی صبح تک برابر سترہ روز دونوں ملکوں میں جاری رہی۔ اور ۲۰ ستمبر کی سلامتی کونسل کی فائر بندی کی قرارداد سے اس کے شعلے عارضی طور پر کچھ سرد پڑ گئے۔

۲۰ ستمبر کو اس قرارداد پر پاکستان کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے وزیرِ خارجہ پاکستان نے سلامتی کونسل میں جو تقریر کی وہ یو۔ این۔ او کی تاریخ کی مؤثر ترین تقریر شمار کی گئی ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے صدرِ پاکستان کے اس پیغام کو دہرایا کہ ہم جنگ بندی کی قرارداد اس شرط کے ساتھ منظور کر رہے ہیں کہ جموں و کشمیر کے تنازعے کا باعزت تصفیہ عمل میں لایا جائے۔ سلامتی کونسل کی بے ضمیری کی پرزور الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے وزیرِ خارجہ پاکستان نے اپنی تقریر کے آخر میں کونسل کو متنبہ کیا کہ ـــ

> ہم نے اقوامِ متحدہ کو آخری موقع دینے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ وہ یہ طے کرے کہ جموں و کشمیر کے مسئلے کے بامقصد، پرامن اور مستقل تصفیے کے لئے وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ ہم اقوامِ متحدہ کو ایک مقررہ مدت کی مہلت دیں گے۔ اگر اس خاص مدت کے اندر سلامتی کونسل نے اپنی ذمہ داریوں اور منشور کے مطابق جس میں حقِ خود ارادی کا اصول مانا گیا ہے، عملی قدم نہ اٹھایا تو پاکستان کو اقوامِ متحدہ سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔

یہ ہے وہ مقام جہاں مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہم کھڑے ہیں اور ایک مقررہ مدت تک انتظار کر رہے ہیں کہ سلامتی کونسل اس مہلت سے کس قدر کام لیتی ہے۔ وزیرِ خارجہ اعلان کر چکے ہیں کہ اس مقصد کے لئے ہم ایک ہزار سال تک بھی جنگ جاری رکھیں گے۔ اور کشمیری عوام کو ان کا حق دلا کر دم لیں گے۔

مذکورہ تفصیلات بتا رہی ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ اب انتہائی نازک اور دو ٹوک مرحلے میں داخل ہو رہا ہے اور سلامتی کونسل ایک کڑے امتحان سے دوچار ہے۔ دنیا بھر کی رائے عامہ پاکستان کے موقف کی پرزور تائید و حمایت کر رہی ہے اور پوری دنیا میں بھارت کا کوئی ہم نوا موجود نہیں۔ ایسی صورت میں سلامتی کونسل کے لئے بہت کچھ سوچنے کا موقع ہے۔ دراصل یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر میں اب فریقین بھارت اور پاکستان نہیں بلکہ خود سلامتی کونسل اور بھارت ہیں۔ پاکستان سلامتی کونسل کے فیصلوں پر اب بھی قائم ہے اور ان پر عمل درآمد چاہتا ہے۔ اس کے خلاف بھارت ان فیصلوں سے کھلم کھلا انحراف اختیار کر چکا ہے۔ وہ علی الاعلان سلامتی کونسل میں اس ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہا ہے کہ وہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کا پابند نہیں۔ لیکن ستم ظریفی اور بے ضمیری کی انتہا یہ ہے کہ اپنے فیصلے سے بھارت کے اس انحراف کی جواب طلبی اور احتساب کی بجائے سلامتی کونسل پاکستان کو فریق مقابل کے طور پر سامنے لاتی ہے کہ وہ بھارت کی ان ہرزہ سرائیوں کا جواب دے جو سلامتی کونسل کے فیصلوں کی موجودگی میں کوئی آئینی اور قانونی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ بھارت کے مجرم ضمیر کی آئینہ دار ہیں۔ جب تک اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر نہیں لایا جائے گا اور اسے پوری اہمیت نہیں دی جائے گی سلامتی کونسل کے اجلاس ایک بین الاقوامی تماشا بنے رہیں گے۔

بین الاقوامی ضابطۂ عدل و انصاف کا تقاضا آج اس کے سوا کچھ نہیں کہ بھارت اور پاکستان کو برابر کی سطح پر فریقین قرار دینے کی بجائے بھارت کو ایک مجرم کی حیثیت دی جائے اور ایک مجرم کی حیثیت سے اس سے یہ جواب طلب کیا جائے کہ سلامتی کونسل کے طے شدہ فیصلہ سے بغاوت اختیار کر کے اس نے اس عالمی ادارے کی جو توہین کی ہے اس کی وجہ جواز کیا ہے؟ یہی بغاوت وہ جرم ہے جس پر بین الاقوامی ضابطوں کو بہت پہلے حرکت میں آ جانا چاہیے تھا لیکن اگر اب تک یہ ممکن نہیں ہوا تو سلامتی کونسل اب [illegible] راستے کو اختیار کرے۔ ورنہ اس کی بے ضمیری اپنے ساتھ اور بہت کچھ لے ڈوبے گی۔

یو۔ این۔ او نے بین الاقوامی سیاست کی بساط پر جو جو گل اس وقت تک کھلائے ہیں ان کے پیش نظر اس کے متعلق بھی وہی کچھ کہا جا سکتا ہے جو علامہ اقبال ؒ نے (مرحوم) لیگ آف نیشنز کے متعلق کہا تھا کہ

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

قضیۂ کشمیر کے سلسلہ میں، ہمارا خیال ہے کہ یہ اس نازک مرحلہ پر پہنچ چکی ہے، جس کے متعلق پھر حضرت علامہؒ ہی کے یہ الفاظ فضا میں گونجتے سنائی دے رہے ہیں کہ

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے   ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

لیکن زمانے کے انداز یہ بتا رہے ہیں کہ ابلیس کے تعویذ اب بے اثر ہو رہے ہیں۔

اس باب میں حرفِ آخر یہ ہے کہ متحدہ اقوام جئے یا مرے۔ پاکستان کو اب زیادہ دیر تک اس کا منہ نہیں تکتے رہنا چاہیئے۔ فیصلہ وہی پائیدار ہوتا ہے جو اپنی قوتِ بازو سے کرایا جائے۔

انسانی مسائل کے حل کرنے میں

عقل انسان آج تک کن ارتقائی مراحل سے گذری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔
تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو صرف پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطون اعظم سے لے کر آج تک، گذشتہ ساڑھے تین ہزار برسوں میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مورخین، اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا کچھ سوچا؟

اسے پڑھئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم پیدا کیا۔

قیمت مجلد ——— بارہ روپے

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

کتابوں کی قیمت میں رعایت

ہم کنونشن کے موقع پر اپنی کتابوں کی قیمت میں رعایت دیا کرتے ہیں۔ پچھلے سال کنونشن نومبر میں منعقد ہوئی تھی لیکن امسال، موجودہ ہنگامی حالات کی وجہ سے اس میں التوا کرنا پڑ گیا ہے۔ لیکن شائقین کا تقاضا ہے کہ اس التوا سے، انہیں کتابوں کی قیمت میں رعایت سے محروم نہ رکھا جائے۔ بنابریں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایک ماہ کے لئے حسب ذیل کتابوں کی قیمت میں رعایت دی جائے گی۔

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
۱۔ انسان نے کیا سوچا	۱۲ روپے	۸ روپے
۲۔ الفتنۃ الکبریٰ	۶ "	۴ "
۳۔ فجر الاسلام	۸ "	۴ "
۴۔ لغات القرآن (سیٹ)	۵۷ "	۴۰ "
۵۔ سلیم کے نام خطوط (سیٹ)	۲۰ "	۱۴ "
۶۔ نظام ربوبیت	۴ "	۳ "
۷۔ ابلیس و آدم	۷ "	۶ "
۸۔ من و یزداں	۱۰ "	۸ "
۹۔ شعلۂ مستور	۶ "	۴ "
۱۰۔ اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ ایڈیشن)	۸ "	۶ "
۱۱۔ سلسبیل	۸	۶ "

ان کے علاوہ دیگر کتب جن پر رعایت نہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قرآنی فیصلے (جلد اول)	۳۔ روپے	۲۵ نئے پیسے
۲۔ " " (جلد دوم)	۳۔ روپے	۲۵ "
۳۔ " " (جلد سوم)	۳۔ روپے	"
۴۔ بہار نو	۵ روپے	-
۵۔ مقام حدیث	۴ روپے	-
۶۔ اسلامی معاشرت	۲ روپے	"
۷۔ اسلام کیا ہے؟ (سستا ایڈیشن)	۴ روپے	"

ضروری وضاحت

۱۔ ہر آرڈر کے ہمراہ کم از کم ¼ رقم پیشگی ارسال کی جائے۔

۲۔ پیشگی خریداروں کو کوئی رقم پیشگی طور پر بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

(۳) یہ رعایت ہر اس آرڈر پر ہوگی جو ۳۰ نومبر تک ادارہ میں موصول ہوگا۔ (۴) محصول ڈاک خریداروں کے ذمہ ہوگا۔ پیشگی خریدار اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ (۵) مفہوم القرآن۔ ادارہ کی مطبوعات میں شامل نہیں۔ اسے میزان شائع کرتی ہے۔ اور ہم اسے اُسی قیمت پر خریداروں کو مہیا کرتے ہیں جس پر میزان سے ہمیں ملتی ہے۔ یعنی پوری قیمت پر۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

قومی دفاعی فنڈ

میں

دل کھول کر چندہ دیجئے

عطیہ۔ مندرجہ ذیل کسی بھی جگہ جمع کرایا جا سکتا ہے۔ کسی بھی ڈاک خانہ یا مندرجہ ذیل بنکوں کی کسی ایک شاخ میں جمع کرائیں

۱۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان	۲۔ نیشنل بنک آف پاکستان
۳۔ حبیب بنک آف پاکستان	۴۔ کامرس بنک لمیٹڈ
۵۔ یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ	۶۔ مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ
۷۔ سٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ	۸۔ آسٹریلشیا بنک لمیٹڈ
۹۔ ایسٹرن مرکنٹائل بنک لمیٹڈ	۱۰۔ بنک آف بہاول پور

عطیات کیسے جمع کرائیں۔؟

نقدی۔ چیک۔ ڈرافٹ۔ پرائز بانڈ سیونگ سرٹیفکیٹ۔ گورنمنٹ سیکورٹیز۔ سونا۔ اور زیورات وغیرہ بطور عطیات مندرجہ بالا کسی بھی جگہ جمع کرائے جا سکتے ہیں۔

جاری کردہ۔ نیشنل ڈیفنس فنڈ کمیٹی۔ پاکستان

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء

۲۷ اکتوبر کی یاد ہمارے ہاں اب ہر سال "یوم انقلاب" کی قومی تقریب کی حیثیت سے منائی جاتی ہے۔ کیونکہ سات سال قبل یہی وہ دن تھا جس کی روشنی میں افواج پاکستان کے سپہ سالار نے آگے بڑھ کر ملک کی بساط سیاست کو الٹ دیا اور مملکت پاکستان کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک نئے عزم کے ساتھ قومی سفر کا آغاز کر دیا۔ انقلابات قومی زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ ہر زندہ قوم کی زندگی میں چھوٹی بڑی تبدیلیاں آئے دن رونما ہوتی ہیں۔ اسی سلسلۂ انقلابات سے قوموں کی موت و حیات اور عروج و زوال کے فیصلے بھی ترتیب پاتے ہیں۔ ہر وہ انقلاب جو قومی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، قوم کا دامن خوش نصیبیوں اور خوشگواریوں سے مالا مال کر دیتا ہے، اور ہر وہ انقلاب جس کی نمود بلند مقاصد سے بے نصیب ہوتی ہے اور ذاتی مفاد پرستیاں اس کا محرک بنتی ہیں، قوموں کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔ ایسے انقلاب نہیں بلکہ درحقیقت فساد کہنا چاہیے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے عسکری انقلاب کا پس منظر کیا تھا؟ اس کی وجہ جواز کیا تھی؟ اس کی بدولت کن تقاضوں کی بجا آوری ممکن ہوئی؟ اس نے ملت پاکستان کو کن اندیشوں سے نجات دلائی؟ ہمارے سفینۂ حیات کو اس نے کس بھنور سے نجات دلائی اور اس کا رخ کس ساحل کی طرف موڑا؟ یہ ہیں وہ سوالات جن کے جواب سے اس انقلاب کی حقیقی اہمیت وابستہ ہے۔ سطور ذیل میں ہم انہی گوشوں کو روشنی میں لا رہے ہیں اور "یوم انقلاب" کی یہ سالانہ تقریب ہم سے اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

طلوع اسلام کا بروقت تجزیہ

اس انقلاب سے قبل ملک کس صورت حال سے دوچار تھا؟ اس صورت حال کا انجام کیا ہوتا اور اس انجام سے پاکستان کو بچانے کی صورت کیا تھی؟ ان تمام سوالات کا تجزیہ "طلوع اسلام" نے انقلاب سے ٹھیک ایک سال قبل اکتوبر ۱۹۵۷ء کے شمارے میں کیا تھا اور اس تجزیہ کے بعد یہ تجویز پیش کی تھی کہ ملک کو بچانے کی واحد صورت اب یہی ہے کہ مملکت کی باگ ڈور فوج کے مضبوط ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔ ہمارے الفاظ یہ تھے ——

سوال یہ ہے کہ ملک میں تشتت و انتشار کے جو شعلے اسوقت بھڑک رہے ہیں، ان کا فوری مداوا کیا ہے؟ اگر ہم جذبات سے الگ ہو کر سوچیں تو یہ بات واضح ہو جائیگی کہ اس دس سال کے تجربے نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ جب زمام حکومت نااہلوں اور ناکرداروں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو مملکت کا حشر کیا ہو جاتا ہے۔ اس تجربے سے اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ خود ارباب حکومت ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ ایک ہی پارٹی کا ایک لیڈر کچھ کہتا ہے۔ دوسرا کچھ ایک ہی کیبنٹ کا ایک وزیر ایک طرف کو جاتا ہے۔ دوسرا دوسری طرف کو۔ وزیراعظم کچھ کہتا ہے اور اس کے وزرا کچھ اور۔ مرکز سے ایک حکم نافذ ہوتا ہے اور صوبہ کا چیف منسٹر اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ صورت حال کو اگر کچھ عرصے کے لئے یونہی رہنے دیا گیا تو حکومت کی مشینری میں انارکی پھیل جائے گی۔ لہٰذا حالات ہمیں خود بخود اس منزل تک لے آئے ہیں جہاں اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ اس "جمہوری تماشے" کو ختم کر کے، ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جائے۔ اور نظم و نسق کو فوج کے مستحکم ہاتھوں میں دے دیا جائے تاکہ انتخابات پرامن اور منظم فضا میں تکمیل تک پہنچ سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ اگر انتخابات کے لئے فضا پرامن ہو گئی تو ہمارے عوام ان لیڈروں میں سے تو کسی کو ووٹ نہیں دیں گے جنہوں نے ملک کو اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔ ہمارے نزدیک موجودہ حالات پر قابو پانے کی کوئی اور شکل نہیں۔

فوجی انقلابات کی تہلکہ انگیزیاں

یہ تھی ہماری تجویز جو ہمارے نزدیک صورت حال کا واحد حل تھی اور اس کی تکمیل ہمارے لئے ایک مقدس آرزو کا درجہ رکھتی تھی۔ تجویز ہم نے پیش کر دی تھی لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ یہ پوری بھی ہو سکے گی یا نہیں۔ لیکن ٹھیک ایک سال بعد، دیکھتے ہی دیکھتے، اس تجویز نے ایک جیتی جاگتی حقیقت کی صورت اختیار کر لی۔ سیاست کے مداری اپنا تماشہ دکھا کر منظر عام سے رخصت ہو گئے اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے نظام مملکت کی باگ ڈور خود اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لی۔ "فوجی انقلاب" کے الفاظ اپنے پس منظر میں خوف و ہراس اور وحشت کے بڑے بھیانک تصورات لئے چلے آ رہے ہیں۔ ان الفاظ سے کشت و خون کی بڑی ہولناک روایات وابستہ چلی آ رہی ہیں۔ سابقہ ادوار کو چھوڑیئے، خود ہمارے

زمانے میں جن ملکوں میں فوجی انقلاب آئے وہاں قوموں کا امن وچین اور ان کی ہر متاع عزیز زیروزبر ہوکر رہ گئی۔ کتنے ہی انسان تختۂ دار پر کھینچ دیئے گئے۔ کتنی ہی گردنیں جلاد کی تلوار سے گاجر مولی کی طرح اڑ گئیں۔ کتنے ہی سینے گولیوں کی بارش سے چھلنی چھلنی کر دیئے گئے۔

لیکن پاکستان کا عسکری انقلاب

لیکن مبدائے فیض کی یہ کیسی کرم گستری تھی کہ پاکستان میں عسکری انقلاب آیا اور اپنے دامن میں اسقدر صبر وضبط اور امن وسکون لئے ہوئے آیا کہ ایک قطرہ خون تک گرنے کی نوبت نہ آئی۔ کسی ایک فرد مملکت کی مکسیر تک نہ پھوٹنے پائی اور سارے ملک کا نقشہ بدل گیا۔ اس لئے کہ یہ فساد نہیں تھا۔ صحیح معنوں میں انقلاب تھا۔ انقلاب آیا۔ بساط سیاست الٹی۔ حکومت کا نقشہ بدلا اور اس کے بعد ملک کے عوام فطرتاً یہ سننے کے لئے گوش برآواز تھے کہ فوجی حکومت کے عزائم کیا ہیں اور ملک کے مستقبل کے لئے وہ کس قسم کے مقاصد اپنے دلوں میں لئے ہوئے ہیں۔ صدر مملکت نے عوام کو زیادہ دیر وقف انتظار نہیں رکھا۔ چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو جب گلستان فاطمہ میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے ان کا خیر مقدم کیا گیا تو ان کے ایڈریس کے جواب میں صدر محمد ایوب خاں نے اپنی تقریر میں کہا ۔

انقلاب کا فلسفہ

اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو تخلیق پاکستان کا موجب بنا۔ برسوں کی بدنظمی اور بددیانتی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اس تحریک کے اغراض ومقاصد کو داغدار اور زنگ آلود بنا دیا تھا جو تشکیل پاکستان پر منتج ہوئی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد ومطامح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کیا جائے کہ انہیں اپنی کھوئی ہوئی آب وتاب اور گم گشتہ عزت وعظمت پھر نصیب ہو جائے ۔

(پاکستان ٹائمز ۱۳ دسمبر ۵۸ء)

اسلامی آئیڈیالوجی کا احیاء

مارچ ۱۹۶۵ء میں صدر مملکت اور قائد انقلاب کو اس عسکری انقلاب کے مقاصد کی نقاب کشائی کا ایک اور موقع راولپنڈی میں ملا۔ اور اپنے خطاب کے دوران انہوں نے حسب ذیل الفاظ میں ان کی مزید وضاحت فرمائی ۔

ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم اس آئیڈیالوجی کا احیاء واستحکام عمل میں لائیں جس کی رو سے پاکستان بحیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان ایک خطہ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی وروحانی اقدار کی امین ہے۔ ہر اقدار اسلام پر

مبنی ہیں۔ ہمارے متجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے ہزار موجبِ فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً خدا ترسی، بنی نوع انسان سے محبت، یتامیٰ کی نگہبانی اور غریبوں کی امداد۔ یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر تم نہ اچھے انسان بن سکتے ہو نہ اچھے پاکستانی۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز ۳/۵۹)

بنیادی اصول اور زمانے کے تقاضے

صدر محترم نے ۲۵ ستمبر ۱۹۶۱ء کو اس مطمح نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کراچی میں ایک سپاس نامہ کے جواب میں فرمایا۔

قرآن کریم نے جو بنیادی اصول دیئے ہیں وہ ابدی ہیں لیکن ان کی تشریح وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اور معاشرہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقتضیات زمانہ کے مطابق ان پر عمل کرے۔ (یاد رکھیئے) صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جن میں عقل و استدلال سے کام لینے کی صلاحیت موجود ہو۔

(بحوالہ نوائے وقت ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء)

سالار انقلاب کا عزم

سالار انقلاب نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو "یوم انقلاب" کی تقریب کے سلسلے میں قوم کے نام اپنا پیغام نشر کیا اور اس میں اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے ہمارے آئین کی اصل و اساس اسلام کی روح ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ اور اسی کی خاطر اسے حاصل کیا۔ ہماری فلاح و بقا کا راز اسی اسلامی روح کے ساتھ دیانتداری سے متمسک رہنے میں ہے۔ ہمارے ملکی نظم و نسق بلکہ ہماری پوری زندگی میں اسلام ہی ہمارا پیش نہاد رہا ہے۔ اور میری کوشش یہ ہے کہ میں کم از کم ایک ایسی مشینری کی بنیاد رکھ دوں جو ہمارے ایمان کی روح کو کشید کر کے اسے ہماری عملی زندگی میں پھونک دے۔ جس سے ہمیں روشنی، ہدایت اور فلاح و سعادت نصیب ہو۔ (پاکستان ٹائمز ۲۷/۱۰/۶۱)

یہ ہیں سالار انقلاب صدر محمد ایوب خان کے ان ارشادات اور نظریات و تصورات کی چند جھلکیاں جو اُن کے اپنے الفاظ میں قارئین کے سامنے پیش کر دی گئی ہیں۔ ان سے یہ اندازہ لگایا

جا سکتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا عسکری انقلاب ہوس اقتدار کی تسکین کا ذریعہ نہیں تھا بلکہ اس کے پیش نظر ایک بلند مقصد تھا اور وہ مقصد وہی تھا جس کے لئے پاکستان کی جنگ لڑی گئی۔ یعنی اسلامی آئیڈیالوجی کا احیاء۔ ہمارے نزدیک یہ مقصد ہمیشہ مستحق تبریک اور قابل ستائش رہا ہے۔ ہم نے تحریک پاکستان میں اپنی بساط بھر حصہ لیا تو اسی مقصد کے پیش نظر اور اس کے بعد پاکستان کے استحکام و سالمیت کے لئے کوششاں ہیں تو اسی منزل تک پہنچنے کی خاطر۔ صدر مملکت کی طرف سے بار بار اس مقصد کا اظہار اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔ اور قابل مبارکباد ہے وہ مملکت جس کا سربراہ ان مقاصد کی تکمیل کا عزم ظاہر کر رہا ہو جن کی خاطر قوم نے ایک عظیم جنگ لڑی اور ایک مملکت کے حصول میں کامیاب ہوئی۔ خدا اس مملکت کو ہر نظریہ سے بچائے کہ یہ اس کے نظام کے احیاء و قیام کا ذریعہ ہے۔

لائل پور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

ہر جمعہ کی شب کو نمازِ عشاء کے بعد نمائندہ بزم، خان محمد اکرم خان
کی قیام گاہ ۸۰-ایم۔اے دی پنجاب ڈیمپرنز
پیپلز کالونی میں ہوتا ہے!

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

ہر اتوار کی صبح — ۹ بجے ۲۵/بی گلبرگ میں
شروع ہوتا ہے —
(نمائندہ بزم لاہور)

بچوں کا صفحہ

مجاہد کون ہے؟

بچو! تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس دفعہ موسم گرما کی چھٹیوں کے بعد بھی تمہارے سکول دوبارہ نہیں کھلے اور چھٹیوں کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے تمہاری تعلیم کا بہت ہرج ہو رہا ہے۔ چنانچہ فرحت اور رشید دونوں بہن بھائی آج کل اُداس اُداس نظر آتے ہیں ان کو یہ خیال ستاتا رہتا ہے کہ کب ان کا سکول کھلے گا اور کب پھر سے باقاعدگی کے ساتھ پڑھنا لکھنا شروع ہوگا۔ ظاہر ہے کہ سکول جانے اور وہاں سب بچوں کے ساتھ مل کر سبق لینے اور سبق یاد کرنے کی جو خوشی ہوتی ہے اور اپنے شفیق اُستاد کی زیرِ نگرانی جو علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ گھر پر رہ کر اپنے آپ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے فرحت اور رشید کو یہ فکر بے چین رکھتی ہے کہ ان کا یہ قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگرچہ وہ روزانہ اپنے اسباق دہراتے ہیں اور کچھ وقت پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ لیکن سکول بند ہونے کے سبب تعلیم میں جو رکاوٹ پڑ گئی ہے اس کے باعث دونوں کی طبیعت بجھی بجھی رہتی ہے۔ فرحت اور رشید جانتے ہیں کہ اپنے پیارے ملک پاکستان کو گذشتہ مہینے جن نازک حالات سے دوچار ہونا پڑا اور جس طرح لڑائی کی آگ میں کودنا پڑا اس کی وجہ سے حکومت کو بچوں کی حفاظت کے لئے سارے تعلیمی ادارے بند کرنے پڑے اور ابھی تک یہ صورت پیدا نہیں ہوئی کہ بچوں کے سکول کھول دیئے جائیں۔ امّی اور ابّا فرحت اور رشید کو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اس جنگ کے متعلق تمام حالات بتاتے اور سمجھاتے رہتے ہیں۔ کہ کس طرح یہ جنگ شروع ہوئی۔ کس نے یہ آگ لگائی۔ کون ہمارے دشمن ہیں۔ کیوں ہمیں اس جنگ کا جواب دینا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ فرحت اور رشید اپنی تعلیم کے علاوہ آپس میں جو باتیں کرتے ہیں وہ زیادہ تر اس جنگ کے بارے میں ہی ہوتی ہیں۔ جب وہ ریڈیو۔

اخبار۔ امّی ابّا اور دوسرے ملنے والوں سے اپنی شیر دل اور بہادر فوج کے ہمیشہ یاد رہنے والے ان کارناموں کا حال سنتے ہیں جو انہوں نے ہندوستان والوں سے لڑتے ہوئے اس جہاد میں سرانجام دیئے تو ان کی وہ اُداسی دور ہو جاتی ہے جو انہیں سکول نہ جا سکنے پہ محسوس ہوتی ہے۔ ان کے خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ خوشی و فخر سے ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ ان کے ننھے سے دلوں میں اپنے جان باز۔ دلیر فوجی بھائیوں کی طرح جذبہ جہاد جوش مارنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں کہ اللہ پاک تو ہمیں جلدی جلدی بڑا کر دے تاکہ اپنے فوجی بھائیوں کی طرح ہم بھی اپنے اس بزدل دشمن کا مقابلہ کر سکیں جس نے چوروں کی طرح چپکے سے ہم پر حملہ کر دیا اور جو ہمارے کشمیری بھائیوں پہ اس قدر ظلم ڈھا رہا ہے اور جس نے ان کی آزادی چھین رکھی ہے۔ ایک دن فرحت اور رشید اپنی اس خواہش کا اظہار کر رہے تھے کہ ان کے چچا جان آ گئے۔ انہوں نے یہ بات سُنی تو بچوں کے اس جذبے سے ان کا دل بہت خوش ہوا پھر انہوں نے دونوں کو شاباش دیتے ہوئے کہا "میرے عزیز بچو! خدا تعالےٰ تمہیں بہت جلد اس قابل بنائے کہ تم اپنے ارادے کے مطابق اپنے دشمن کے دانت کھٹے کر سکو لیکن میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ ایسی جنگ جو مظلوم کو ظالم کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے اور جھوٹ اور فریب کو ختم کر کے حق کا بول بالا کرنے کے لئے لڑی جاتی ہے اسے جہاد کہتے ہیں اور اس جہاد میں صرف فوج ہی دشمن مقابلہ نہیں کرتی بلکہ ملک کا ہر شہری اور قوم کا ہر بچہ ہتھیار اٹھائے بغیر بھی اپنی اپنی جگہ مجاہد ہوتا ہے کیوں کہ اس نیت اور اس مقصد کے ساتھ کہ حق کی راہ پر جم کر کھڑے رہنا۔ ظلم کو مٹانا اور انصاف کو قائم کرنا ہے جو مرد جو عورت اور جو بچہ جتنی بھی کوشش کرے گا اس کا شمار جہاد میں ہوگا۔ اپنے ملک کو قائم رکھنے اور اپنے دین کو سربلند کرنے کے لئے مل جل کر جو کوشش کی جاتی ہے وہ ضرور بار آور ہوتی ہے اور حق کا دامن پکڑنے والی قوم کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔" فرحت اور رشید نے بڑے غور سے اپنے چچا جان کی یہ باتیں سُنیں۔ چچا جان پھر بولے "دیکھو بیٹا! تم آج کل سکول نہیں جا سکتے" اور اس وجہ سے تمہیں اکتاہٹ بھی ہوتی ہے مگر تم اس کی جگہ ایسے کام کر سکتے ہو اور اپنے اس فارغ وقت کو اتنا کار آمد بنا سکتے ہو کہ تمہارا شمار بھی مجاہدوں میں

ہونے لگے۔ "کیا واقعی چچا جان؟" دونوں بچوں نے یکبارگی حیرت سے پوچھا۔ "بالکل!" چچا جان نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ "اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے دن بھر کا ایک پروگرام بناؤ اور اس میں اپنی ضروریات کا خیال کرنے کے علاوہ کچھ وقت ایسا رکھو جو تم دوسرے بہن بھائیوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں دے سکو۔ جنگ کے اس زمانے میں تمہیں اپنے ہی جیسے بہت سے بچے ایسے نظر آئیں گے جن کا گھر بار لٹ چکا ہے جو اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئے ہیں۔ جن کے پاس پہننے کو کپڑا نہیں۔ کھانے کو روٹی نہیں۔ تم ان کے لئے اپنی ہمت کے مطابق بہت کچھ کر سکتے ہو۔ تم کسی ایک ایسے بھائی یا بہن کے لئے اپنی جیب خرچ میں سے کچھ رقم دے سکتے ہو۔ اپنے کپڑوں میں سے اسے کپڑے پہنا سکتے ہو۔ اپنے کھانے میں اسے شریک کر سکتے ہو۔ تم محلے والوں سے ان ضرورت مندوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کام کی چیزیں جمع کر سکتے ہو۔ اسکی ہمت بندھا سکتے ہو اسکی دلجوئی کر سکتے ہو۔ اپنی تفریح میں اسے شامل کر کے اسکا دل خوش کر سکتے ہو اسے پڑھنا لکھنا سکھا سکتے ہو۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام ایسے ہیں جو تم کر سکتے ہو اور یہی تمہارا جہاد ہوگا۔" (شریا عندلیب)

اسلامی معاشرت

پرویز صاحب کی اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک چکے ہیں۔ شائقین کے شدید اصرار اور طویل انتظار کے بعد اب یہ نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ یہ مختصر سی کتاب اپنے انتہائی سادہ اور دلنشین انداز میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور روزمرہ کی زندگی میں قرآنی ہدایات کی روشنی سے قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتی ہے

یہ ایڈیشن بھی ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔ اس لئے بلا تاخیر حاصل کر لیجئے۔

ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی گلبرگ - لاہور

ایڈیٹر صفدر سلیمی۔ پبلشر۔ سراج الحق ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور۔ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور